حدیثِ پاکستان

مفکّرِ اسلام مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی

مجلسِ نشریاتِ اسلام

اے کے ۔ ۳ ۔ ناظم آباد مینشن ۔ ناظم آباد ۔ کراچی ۱۸

سلسلۂ مطبوعات ۳۳

حدیثِ پاکستان

یعنی

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کی وہ اہم اور فکر انگیز تقریریں جو موصوف نے
اپنے دورۂ پاکستان (۶؍ جولائی لغایت ۲۸؍ جولائی ۱۹۷۸ء) میں
مختلف اسلامی اجتماعات، جامعات اور مدارس
کراچی، اسلام آباد، پشاور، فیصل آباد اور لاہور
میں کیں

◉

ناشر

فضلِ ربّی ندوی

مجلس نشریاتِ اسلام ۱/کے-۳- ناظم آباد مینشن
نزد برف خانہ، ناظم آباد ۱ کراچی ۱۸

نام کتاب	ــــــــــ	حدیث پاکستان
مصنف	ــــــــــ	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
سال اشاعت	ــــــــــ	۱۹۷۹ء
تعداد	ــــــــــ	ایک ہزار
کتابت	ــــــــــ	انوار ہاشمی
مطبوعہ	ــــــــــ	ایجوکیشنل پریس کراچی
قیمت مجلد	ــــــــــ	=/۱۲

•

طابع وناشر

فضل ربی ندوی

مجلس نشریات اسلام - ناظم آباد ۱ کراچی ۱۸

ترتیب

صفحہ

طالبانِ علومِ نبوت سے خطاب ۱۳۱

(خطابات جو مدارسِ عربیہ اور علوم دینیہ کے مطالعہ کے حلقوں کے سامنے ہوئے)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

از

مولوی محمد الحسنی ندوی، مدیر "البعث الاسلامی" (عربی)

پیش نظر مجموعہ ان اہم تقریروں پر مشتمل ہے جو عم مخدوم و معظم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے حالیہ دورۂ پاکستان کے موقع پر کی گئیں، اور جنھوں نے دماغ کو بھی جھنجھوڑا اور دل کے تاروں کو بھی چھیڑا، اور ملک و ملت کے مسائل میں از سرِ نو سوچنے، سمجھنے اور عمل کرنے کی ایک تحریک پیدا کردی۔

مولانا مدظلہٗ کو دنیا کے مختلف ممالک بالخصوص عالمِ اسلام کی سیاحت کا بار بار موقع ملا ہے، اور انھوں نے اس کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ جہاں بھی گئے وہاں اس ملک کے دردمند انسانوں اور بہی خواہوں سے انھوں نے صاف و بے لاگ باتیں کیں، اس کی خدمات اور کارناموں کا کھلے دل سے اعتراف کیا اور اس کے اصل مرض کی نشاندہی کی، سب سے پہلے وہ حجاز تشریف لے گئے کہ وہی مومن کا اولین سرچشمۂ ہدایت، مرکزِ فیضان اور اس کے طائرِ روح کا اصل نشیمن ہے۔ وہاں انھوں نے "بین العالم وجزیرۃ العرب" کے نام سے چند ریڈیائی تقریریں جن میں جزیرۃ العرب اور اس کے گرد و پیش پھیلی ہوئی دنیا کا دلچسپ مکالمہ پیش کیا گیا تھا، اس کے بعد وہ مصر گئے اور "اسمعی یا مصر" (سن اے مصر) کے نام سے اس کو خطاب کیا، شام گئے تو "اسمعی یا سوریہ" (سن اے شام) کے عنوان سے اپنا دردِ دل اس کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ کویت تشریف لے گئے تو "اسمعی یا زہرۃ الصحرا" (سن اے لالۂ صحرا) کے عنوان سے تلخ و شیریں دونوں حقیقتیں اس کے سامنے بیان کردیں۔ ایران گئے تو "اسمعی یا ایران...

(من لے ایران)[1] کے نام سے ایک رسالہ لکھ کر فریضۂ حق ادا کیا۔ یورپ کا سفر ہوا تو حدیث مع المغرب (مغرب سے صاف صاف باتیں) کے نام سے اس کو اس مقام بلند سے خطاب کیا جو مومن کے شایانِ شان تھا، امریکہ کا سفر پیش آیا تو "احادیث صریحۃ فی امریکا (نئی دنیا (امریکہ) میں صاف صاف باتیں)" کے عنوان سے بنی نوع کے لئے اس کی ہلاکت آفرینی کا نقشہ کھینچا اور وہاں تعلیم حاصل کرنے مسلم طلبہ اور بسنے والے مسلمانوں کو ان کا فرض یاد دلایا، بایں ہمہ ان کی زبان حال گویا ہی کہ

اندکے پیش تو گفتم غمِ دل ترسیدم
کہ تو آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

لیکن عجیب اتفاق کہ ان کا پڑوسی ملک اب تک "اسمعیات" کے اس سلسلۃ الذہب سے محروم تھا، اسلامی ایشیائی کانفرنس کراچی[2] کے موقع پر یہ فرض یا قرض بخوبی ادا ہوا۔ مولانا حجاز سے جہاں وہ مدینہ یونیورسٹی کی مشاورتی کونسل میں شرکت کے لئے تشریف لے گئے تھے، براہ راست پاکستان تشریف لائے اور کیا عجب اس دورہ کی کامیابی اور اثر انگیزی و دل پذیری میں اس حاضری کا سب سے بڑا دخل ہو کہ ؎

کار زلفِ تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

سفر پاکستان ایسے وقت ہوا جب یہ ملک ایک نازک مرحلہ سے گزر رہا ہے اور ایک دوراہے پر کھڑا ہے۔ یہ ایک پیاسی سرزمین ہے جس کو تیس برس تک اسلام کے آبحیات سے محروم رکھا گیا اور معاشرہ اور قانون کو اسلامی سانچہ میں ڈھالنے کی کوئی سنجیدہ و مخلصانہ کوشش نہیں کی گئی۔

"حدیث پاکستان" کے نام سے یہ آواز ہر مخلص مسلمان اور ملک و ملت کے بہی خواہ کو آواز دے رہی ہے کہ صحیح شعور، جذبۂ صادق، قوتِ ارادی اور عمل پیہم سے کام لے کر وہ اب اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا راستہ

---

[1] اس کا فارسی ترجمہ "سخنانِ چند با برادران ایران" کے نام سے شائع ہو گیا ہے۔ [2] منعقدہ ۶، ۷، ۸ جولائی ۱۹۷۸ء

راستہ صاف کر دے جس پر ہماری غفلت، ناخدا ترسی اور مسلسل سازشوں اور تخریبی عمل نے بے حد و حساب ملبہ اکٹھا کر دیا ہے، اور اس ملبہ کو اٹھانے کے لئے آج کی مغرب زدہ معاشرت اور سوسائٹی میں ہمہ گیر اور مکمل انقلاب کی ضرورت ہے۔ اور یہی انقلاب وہ پائدار اساس ہے جس پر اسلامی انقلاب کا محل تعمیر کیا جا سکتا ہے۔

اس سفر میں مولانا کو ہر طبقے اور ہر مکتبِ فکر سے ملنے اور تبادلۂ خیال کرنے اور ان کے سامنے اپنے خیالات پیش کرنے کا پورا موقع ملا۔ ان میں قانون داں اور وکلاء بھی تھے اور علماء و اہلِ فکر بھی، طالبان علوم نبوت بھی، جامعات اور دانشگاہوں کے طلبہ و فضلا بھی، مخلص و سادہ دل مسلمان بھی، اعلیٰ سرکاری افسران اور حکام بھی، تاجر اور اہل ثروت بھی۔

ان تقریروں کو ریڈیو، اخبارات اور ٹیلیویژن کے ذریعے ہمارے ملک اور اسلامی ایشیائی کانفرنس کی تقریر کو مختلف عرب ممالک میں بھی پیش کیا گیا اور ہر جگہ حاضرین نے اس کو بہت توجہ اور اشتیاق کے ساتھ سنا، اور اچھا اثر قبول کیا۔ ان تقریروں سے اس انتشار ذہنی اور غیر یقینی کیفیت کو زائل کرنے میں مدد ملی جس میں ادنیٰ تاخیر ناقابل تلافی نقصانات پہنچا سکتی تھی۔

راقم سطور نے جسے اس مبارک قافلہ میں جس میں مولانا معین اللہ ندوی نائب ناظم ندوۃ العلماء، اور مولانا اسحٰق جلیس ندوی ایڈیٹر تعمیر حیات شامل تھے، شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ ہر جگہ اس تاثیر اور تاثر کے مظاہرے دیکھے اور خدا کی نصرت و تائید کھلی آنکھوں نظر آئی۔

یہ تقریریں مختلف موضوعات پر کی گئیں اور مختلف طبقے اس کے مخاطب تھے۔ اس لئے ان کو دو تین ابواب پر تقسیم کر دیا گیا ہے۔

یہ تمام مسلمانوں کے لئے بالعموم اور پاکستان کے لئے بالخصوص ایک قیمتی سوغات ہے اور ایسے وقت پیش کی جا رہی ہے جب ہمارے پڑوسی ملک کو اس کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ یہ اس تاریخی سفر کی سب سے قیمتی امانت ہے امین و پاکیزہ ہاتھوں کے حوالے کی جا رہی ہے۔

مولوی فضل ربی ندوی ناظم مجلس نشریات اسلام کراچی، جن کی کوششوں سے مولانا کی کتابیں پاکستان میں شائع ہوئیں اور ہر حلقہ میں مقبول ہوئیں اور جس کے اثرات ہم نے جا بجا محسوس کئے" وہ ہم سب کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ امید ہے کہ یہ کتاب جو اسی ادارہ سے شائع ہو رہی ہے انشاء اللہ اور زیادہ مقبول ہوگی اور وقت کی یہ آواز ہر پاکستانی مسلمان کے دل کو دستک دیگی اور اسلامی تاریخ کے اس مقفل دروازے کو کھولنے میں معاون و مددگار ثابت ہوگی جس کو صرف زور بازو یا زور بیان سے نہیں کھولا جا سکتا اور جو طویل عرصہ سے ایک ایسے فاتح اور کشور کشا کا منتظر ہے جو بیک وقت دماغوں کو بھی فتح کر سکے اور دلوں کو بھی جیت سکے۔ واللہ ولی التوفیق

محمد الحسنی

لکھنؤ

۱۰ر شوال ۱۳۹۸ھ

۱۶ر ستمبر ۱۹۷۸ء

ملک وملّت کے تقاضے

اور

ذمّہ داریاں

(دورۂ پاکستان کی وہ تقریریں جو تعلیم یافتہ و بااثر اصحاب کی
نمائندہ و موقر مجلسوں میں کی گئیں)

باسمہٖ سبحانہٗ

کاروانِ ملّت کا جلیل القدر مُسافر

رابطۂ عالمِ اسلامی مکہ مکرمہ کی طرف سے پہلی ایشیائی کانفرنس منعقدہ کراچی کے اختتام پر ۹ر جولائی ۱۹۷۸ء کو پاکستانی قومی اتحاد کے سیکریٹری جنرل پروفیسر غفور (وفاقی وزیر صنعت وپیداوار حکومت پاکستان) نے مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب کو ایک استقبالیہ دیا، اس استقبالیہ جلسہ میں مختلف سیاسی جماعتوں کے رہنما، دینی تعلیمی، سماجی حلقوں کی نمائندہ شخصیتیں، ممتاز ادیب وصحافی، علمی ودینی حلقہ کے معروف اصحاب، نیز اسلامی ایشیائی کانفرنس میں آئے ہوئے مختلف ممالک کے مندوبین کی معتدبہ تعداد شریک تھی۔

بعد خطبۂ مسنونہ :۔

دل کہے اور دل سُنے

حضرات! میں سب سے پہلے تو آپ کی اس محبت اور اعتماد کا شکریہ ادا کرتا ہوں جس کا آپ نے مجھے اہل سمجھا اور اس لگاتار بارش کے موسم میں یہاں تک تشریف لانے کی زحمت گوارا کی، بعض مواقع ایسے ہوتے ہیں کہ انسان الفاظ اور زبان کو جو جذبات اور خیالات کے اظہار کا عام ذریعہ ہے، ناقص سمجھنے لگتا ہے، آپ سب کو معلوم ہے کہ میں اپنے خیالات کا اظہار زبان وقلم سے مختلف موقعوں پر کرتا رہتا ہوں، لیکن میں بے تکلف آپ کے سامنے اس احساس کا اظہار کر رہا ہوں کہ مجھے الفاظ کا بڑے سے بڑا ذخیرہ اور زبان کی بڑی سے بڑی روانی اس وقت ناکافی معلوم ہوتی ہے جب سامعین کا خلاصہ، تعلیمیافتہ اور صاحب فکر طبقہ کا عطر، اور ملّت کا دل ودماغ سامنے ہو، تو پھر جی چاہتا ہے کہ دماغ کہے اور دماغ سُنے یا دل کہے اور دل سُنے، لیکن

ابھی تک سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ میری آواز کے ساتھ میرے دل کی دھڑکنیں بھی آپ تک منتقل ہو سکیں، یہ تو کچھ ان اہلِ دل کا معمول یا خدا کا انعام تھا کہ دل دل سے باتیں کرتے تھے۔

میں اس وقت ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوں کہ بات کہاں سے شروع کروں اور اپنی بات کو کس طرح سمیٹوں، میں نے کل اسلامی ایشیائی کانفرنس کی اختتامی تقریر میں جو عربی میں تھی، تین اشعار انتخاب کئے تھے، میں تھوڑی دیر عالمِ تحیر میں رہا کہ کس زبان کا انتخاب کروں، سب سے پہلے تو مجھے خیال آیا کہ اردو زبان میں خطاب کروں کہ مسلمانوں کی سب سے بڑی تعداد اسکو سمجھتی اور بولتی ہے لیکن پھر مجھے عربی زبان سے شرم آئی کہ میں اس کو کیا جواب دوں گا، وہ قرآن کی زبان ہے، ایمان کی زبان ہے اور رابطۂ عالمِ اسلامی کی بھی سرکاری زبان ہے، جس کے اسٹیج سے میں تقریر کر رہا تھا، اس لئے میں نے اس کا حل یہ تلاش کیا کہ میں ان تین زبانوں سے جن میں شُد بُد رکھتا ہوں ایک ایک شعر منتخب کر لوں، چونکہ آپ حضرات اس وقت تشریف نہیں رکھتے تھے اس لئے میں ان کو پھر دُہراتا ہوں۔

میں نے عربی کا یہ شعر انتخاب کیا ؎

حمامة جرعی حومة الجندل سجعی

فانت بمرأی من سعاد ومسمع

اے حومۃ الجندل کے ریگ زار کے کبوتر! اس سے بہتر چہکنے کا کوئی موقع نہیں اس لئے کہ سُعاد (محبوبہ) قریب ہے۔ وہ دیکھ بھی رہی ہے۔

میں نے کہا آپ سب اس محفل کے سعاد ہی نہیں سعدا ہیں۔

فارسی میں عرفی یا نظیری، یا حافظ یا جامی کا کوئی شعر انتخاب کرتا اور پڑھ سکتا تھا، لیکن مجھے اقبال سے شرم آئی کہ اس سرزمین کا سب سے بڑا فارسی گو شاعر ہے، میں اس کو چھوڑ کر عرفی و نظیری کی طرف کیوں جاؤں؟ میں نے ان کا یہ شعر انتخاب کیا ؎

تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ
عشق کاریست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند

پھر میں نے کہا کہ میں اردو کا شعر اپنے ہی شہر لکھنؤ کے نامی گرامی شاعر امیر مینائی کا انتخاب کرتا ہوں ؎

امیر جمع ہیں احباب حالِ دل کہہ لے
پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

میں نے یہ کہانی اس لئے دہرائی کہ یہ آخری شعر اس وقت بالکل حسب حال اور اس موقع کے لئے زیادہ موزوں ہے۔

حضرات! میں سمجھتا ہوں کہ ایک صاحبِ پیغام، صاحب امر و نہی اور سیاسی وزن رکھنے والی اور دنیا میں ظلم و زیادتی کو روکنے کی صلاحیت رکھنے والی، عدل و مساوات کا سبق سکھانے والی اور خدا کا پیغام بلند سطح سے پہنچانے والی ملت کی حیثیت سے فیصلہ کی دو گھڑیاں تھیں، میرے نزدیک ایک تو وہ دن تھا جب سلطنتِ عثمانیہ کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا، یعنی یہ کہ سلطنت عثمانیہ نہ صرف باقی رہے گی، بلکہ اس طرح باقی رہے گی کہ دنیا کے سیاسی نقشہ پر وہ کوئی اثر ڈال سکے گی، بہ حیثیت امت کے پاسبان اور خادم کے اس کا وجود برقرار رہے گا یا نہیں؟ حقیقت میں یہ عثمانی ملت کی تقدیر کا فیصلہ نہیں تھا، بلکہ ملتِ اسلامیہ کی تقدیر کا فیصلہ تھا، اس لئے کہ بعض اوقات پیغاموں کی قسمت ملتوں سے وابستہ ہو جاتی ہے، اس لئے کہ پیغام کبھی خلا میں نہیں ہوتا، اور ملت بھی خلا میں نہیں ہوتی، اسی زمین پر اس کا وجود قائم ہوتا ہے، امتِ اسلامیہ اپنا سیاسی وزن قوموں پر موقت کے اہم فیصلوں پر، تاریخ کے دھارے پر ڈال سکے گی یا نہیں؟ اس کا موقع یا تو اس دن تھا، جب سلطنت عثمانیہ کی قسمت کا فیصلہ ہونے جا رہا تھا یا دوسرا موقع وہ ہے جو آج درپیش ہے۔

پاکستان ایک موڑ پر کھڑا ہے

پاکستان آج ایک موڑ پر آ کے کھڑا ہو گیا ہے، کاتبِ تقدیر قلم لئے کھڑا ہے کہ کیا لکھے، بہت سے ایسے مواقع ہوتے ہیں کہ اگر ہماری آنکھیں عالمِ غیب کی چیزوں کو دیکھ سکتی ہیں تو ہم دیکھیں گے کہ کاتبِ تقدیر فیصلۂ الٰہی کا منتظر ہے۔ یہ تو میں نہیں کہوں گا کہ وہ آپ کا منتظر ہے لیکن فیصلۂ الٰہی کا منتظر ہے، اور فیصلۂ الٰہی بہت سی چیزوں پر موقوف ہوتا ہے، اس لئے نہیں کہ خدا کسی کا محتاج ہے، بلکہ یہ سنت اللہ ہے۔ سنت اللہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے کہ قوموں میں کہاں تک اخلاص ہے، کتنا عزم ہے، کس قدر صلاحیتیں ہیں، کچھ تقدیریں ہوتی ہیں جو بدلتی رہتی ہیں، اور بدلی جا سکتی ہیں جن کو ہماری قدیم زبان میں تقدیرِ معلق کہتے ہیں، تقدیرِ معلق کا جہاں تک تعلق ہے بعض مرتبہ اگر دیکھنے والی آنکھیں ہوں اور قرآن کا گہرا مطالعہ ہو تو معلوم ہوتا ہے جیسے کاتبِ تقدیر منتظر ہے فیصلۂ خداوندی کا بعض اوقات کسی جماعت کے حق میں اور بعض اوقات کسی فرد کے حق میں کہ کیا فیصلہ لکھے؛ وہ وقت ایسا ہوتا ہے کہ اس کا ایک لمحہ صدیوں کے برابر ہوتا ہے، اس کی ایک لغزش پوری پوری قوم کے سفینہ کو غرق کر دینے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ فارسی کے ایک شاعر نے کبھی کہا تھا ؎

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

شاعر اپنی ذہانت اور قوتِ متخیلہ سے بہت سے ایسے مضامین بیان کر دیتے ہیں جن کا اصل مصداق ابھی تک پیدا ہی نہیں ہوا۔ وہ اپنی طباعی اور مضمون آفرینی سے بعض باتیں کہہ جاتے ہیں۔ بعض مرتبہ برسوں کے بعد، بعض مرتبہ صدیوں کے بعد وہ وقت آتا ہے جب اس شعر کی صحیح تشریح ہوتی ہے، اور اس میں جان پڑتی ہے۔ مجھے اس میں بڑا شک ہے کہ شاعر نے جس وقت یہ لافانی شعر کہا تھا، اس وقت اس کے

سامنے کوئی ایسا واقعہ تھا کہ کسی مسافر کسی شریک کارواں کو اپنے تلوے کے کانٹے نکالنے کے لئے بیٹھنا پڑا ہو اور کارواں گذر گیا ہو، وہ کارواں کیا تھا، وہ مسافر کیا تھا؟ کہنے والے نے کیا سوچ کر کہا تھا اور کس واقعہ کی طرف اس کا اشارہ ہے؟ میرے خیال میں وہ واقعہ اس لازوال شعر کا ہرگز مستحق نہیں ہوگا۔ شاعر کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ ہوگی کہ ایک ملک اُبھرے گا، ایک طاقت اُبھرے گی، ایک کارواں، ملّتِ اسلامی کا ایک کارواں رواں دواں ہوگا، اور اس ملّت کے کاروانِ حیات کا ایک مسافر جس کا نام پاکستان ہے، اپنے پاؤں کی کوئی پھانس نکالنے کے لئے کارواں سے بچھڑ جائے گا (میں ان پھانسوں کی طرف اشارہ نہیں کروں گا، ان کا تعین نہیں کروں گا، اس لئے کہ یہ اس شعر کی عظمت اور اس کی منزل کی اہمیت کے خلاف ہوگا، اس شعر کو یہ بات مجروح کرے گی کہ میں کسی پھانس کا نام لوں، اس لئے یہ تو میں آپ پر چھوڑتا ہوں کہ آپ دل کی کن کن پھانسوں کا تصور کریں گے) لیکن یہ واقعہ ہے کہ اگر یہ شعر صحیح طور پر منطبق ہوتا ہے تو ہماری اور آپ کی موجودہ صورت حال پر۔

کاروانِ ملّت کا جلیل القدر مُسافر

پاکستان اس کاروانِ حیات کا ایک جلیل القدر مسافر ہے، ملّت کا کارواں سفر کی منزل میں ہے اس کی صفِ اوّل کا ایک مسافر جس کے پاؤں میں کچھ کانٹے چبھ گئے ہیں، یا کچھ پھانسیں لگ گئی ہیں۔ ان پھانسوں کو دور کرنے میں اگر اس نے تاخیر سے کام لیا، اگر اس حالت میں اس کو نیند آگئی، اگر اس حالت میں وہ کسی اور مسافر سے دست وگریباں ہوگیا تو اندیشہ ہے کہ ملت کا کارواں بچھڑ کر رہ جائے، اس وقت آپ کی ذرا سی لغزش ملّت کی قسمت پر مہر لگا سکتی ہے۔ ملّتِ اسلامیہ پر آپ کا صحیح یا غلط فیصلہ اس طرح اثر انداز ہوسکتا ہے کہ ایک صدی دو صدی تک اس ملّت کی قسمت پر پھر ایک اور قفل پڑ جائے اور اس کی چابی خدانخواستہ گم ہوجائے، اس لئے آپ بڑے نازک مقام پر کھڑے ہیں۔

اس مقام پر بڑی قربانی کی ضرورت ہے، مجھے افسوس ہے کہ قربانی کا لفظ اتنی کثرت سے استعمال ہوا ہے اور ہماری سیاسی تحریکوں نے (لکھنؤ کی زبان میں کہوں گا کہ) اس کی مٹی ایسی پلید کی ہے اور علمی زبان میں کہونگا کہ اس کا ایسا غلط استعمال کیا ہے کہ وہ اپنی طاقت کھو چکا ہے، قربانی تو وہ چیز ہے کہ اس کو سنتے ہی بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں لیکن ہم قربانی کا لفظ جب استعمال کرتے ہیں تو ملازمت کی قربانی کو، تنخواہ کی معمولی سی قربانی کو اس کا مصداق سمجھتے ہیں، لیکن قربانی وہ باعظمت اور مقدس چیز ہے جس کی تاریخ ابراہیم علیہ السلام کی قربانی پر ختم ہوتی ہے، ہر چیز کا شجرۂ نسب ہوتا ہے، مسجد کا شجرۂ نسب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنائی ہوئی مسجد کعبہ بیت اللہ سے ملتا ہے، اور جس مسجد کا نسب مسجد ابراہیمی پر جا کر ختم نہ ہو وہ مسجد خانۂ خدا کہلانے کی مستحق نہیں، وہ مسجد ضرار ہے اور جس مدرسہ کا شجرۂ نسب صفۂ نبوی پر ختم نہ ہو وہ مدرسہ دانشکدہ نہیں جہالت کدہ ہے، تو اس طرح میں کہوں گا کہ جس قربانی کا شجرۂ نسب ابراہیم خلیل اللہ کے جذبۂ ایثار و حُبِّ خدا اور حضرت اسماعیل ذبیح اللہ کی بے نفسی و تسلیم و رضا پر ختم نہ ہو وہ صحیح النسب نہیں ہے۔

تین قسم کی قربانیاں

آپ کو تین طرح کی قربانیاں دینی ہیں۔ ہماری ہر قربانی کے لیے ہماری تاریخ میں ایک امام موجود ہے۔ ایک قربانی وہ ہے جو سیدنا خالد بن ولیدؓ نے یرموک میں دی تھی، دوسری قربانی وہ ہے جو حضرت حسن بن علیؓ نے حضرت معاویہؓ کے مقابلہ میں اُمت کے انتشار کو ختم کرنے کے لئے دی تھی، تیسری قربانی ہے وہ جو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے (اسلامی مملکت اور معاشرہ کو اسلامی زندگی اور اسلامی سیرت کی راہ پر لگانے کے لیے) اپنی زندگی کو بدل کر اور اپنے خاندان کے مفاد سے آنکھیں بند کر کے دی تھی، اب یہ تینوں قربانیاں پاکستان کی اس ملت اسلامیہ کو درپیش ہیں۔

حضرت خالد بن ولید کی قربانی یہ پیغام دیتی ہے کہ عین میدانِ جنگ میں اگر معزول کر دیا جائے تو پیشانی پر

شکن نہ آئے اور یہ الفاظ تاریخ کے ریکارڈ نے اسی وقت محفوظ کر لئے کہ "اگر میں عمرؓ کے لئے لڑتا تھا تو اب نہیں لڑوں گا، اور اگر اللہ تعالیٰ کے لئے لڑتا تھا تو میرے جوش و سرگرمی میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔" اور دنیا نے دیکھ لیا کہ اللہ کے سچے بندے نے اس کو سچا کر دکھایا کہ اس کے جوشِ جہاد اور شوقِ شہادت میں کوئی فرق نہیں آیا، دنیا کی تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے کہ جس شخص کا نام فتح کے ساتھ اس طرح گھل مل گیا تھا کہ ان میں فرق کرنا مشکل تھا وہ نام فتح کی علامت واثر (SYMBAL) بن گیا تھا۔ لوگ پوچھتے تھے معرکہ میں خالدؓ ہیں یا نہیں؟ اگر جواب ملتا کہ وہ ہیں تو دل امیدوں سے بھر جاتے تھے، اصل بھروسہ خدا پر تھا لیکن ان کی موجودگی کو فالِ نیک سمجھتے تھے، دنیا کی تاریخ اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی، فاروق اعظمؓ کی عظمت کے سامنے خدا اعتمادی و خود اعتمادی کے جوہر کے سامنے مورخ حیران ہو کے کھڑا ہو جاتا ہے کہ اس خدا کے بندے نے اس ملت کے لئے اور قیامت تک کے لئے ایک نظیر قائم کرنے کے لئے یہ قدم اٹھایا، اتنا خطرناک قدم کہ میں سمجھتا ہوں کہ جنگوں کی تاریخ میں اتنا خطرناک قدم نہیں اٹھایا گیا، اور اتنا بڑا خطرہ (RISK) مول نہیں لیا گیا کہ عین اس وقت جب سب سے بڑا فیصلہ کن معرکہ در یرموک کی جنگ) درپیش تھا، مدینہ سے ایک شخص آتا ہے اور حضرت خالدؓ کی معزولی اور حضرت ابو عبیدہؓ کے تقرر کا پروانہ ہاتھ میں دیتا ہے اور لوگوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ خالدؓ اب کمانڈر انچیف یا قائد الافواجِ اسلامی نہیں رہے، انھوں نے سر جھکا دیا اور سب سپاہیوں نے دیکھا کہ خالدؓ معزول کر دیئے گئے، اور خالدؓ نے اس وقت کہا کہ میں اسی طرح لڑوں گا، کیونکہ میں اللہ کے لئے لڑتا ہوں۔

ملت کا مفاد مقدم رکھیں

ایک قربانی آپ کو اس ملک میں یہ دینی ہے کہ ملت کے مفاد کو اپنے مفاد پر جماعت کے مفاد پر برادری کے مفاد پر اور یہاں تک میں عرض کرتا ہوں کہ ملت کی ضرورت کا جو عنوان اور راستہ ہم نے تجویز کیا ہے، اس پر بھی آپ ملت کے مفاد کو مقدم رکھیں، اس لئے کہ جماعتیں ملت کے لئے ہیں، ملت جماعتوں کے لئے نہیں۔۔۔۔

مولانا محمد یوسف صاحب امیر جماعت اسلامی ہند یہاں بیٹھے ہوئے ہیں، میں نے ہندوستان میں مسلم مجلس مشاورت کے پلیٹ فارم پر بھی یہ بات کہی تھی، اس وقت بھی اس پر ایمان رکھتا تھا اور اب بھی ایمان رکھتا ہوں کہ اگر ملّت کے مفاد کا تقاضا ہو کہ حرف غلط کی طرح جماعتوں کو مٹا دیا جائے تو میرے اخلاص کا تقاضا ہوگا کہ سب سے پہلے میں اسے قبول کروں، یہ وہ قربانی ہے جس کا سبق حضرت خالد بن ولید کی قربانی ہمیں دیتی ہے۔

حضرت حسنؓ کی قربانی کی عظمت کو ہمارے اچھے اچھے مؤرخ بعض مرتبہ سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں، لیکن حقیقت میں وہ قربانی بھی کسی قربانی سے کم نہیں کہ وہ نواسۂ رسولؐ تھے، بڑے نواسے تھے۔ انصارِ علیؓ کی تلواریں نیام سے ابھی باہر تھیں، اس وقت جو شخص بھی صورتِ حال کا جائزہ لیتا وہ یہ پیش گوئی کر سکتا تھا کہ ابھی بڑی فوجی طاقت حضرت حسنؓ کے ساتھ ہے اور مسلمانوں کی جذباتی وابستگی بھی ان کے ساتھ ہے۔ ان کے ساتھ شرعی دلائل تھے، وہ نواسۂ رسولؐ تھے اور خلیفۂ راشد تھے۔ ان کے ہاتھ پر بیعت ہو چکی تھی۔ انھوں نے دیکھا کہ یہ کشمکش بے نتیجہ ثابت ہوئی اور میرے جلیل المرتبت والد کی توانائیوں کا بڑا حصّہ اس میں صرف ہو گیا، ان کا یہ ایک اجتہاد تھا کہ انھوں نے خلافت سے کنارہ کشی اختیار کی، ایک قربانی وہ ہے جو ان کے بعد ان کے عظیم المرتبت بھائی حضرت حسینؓ نے یزید کے مقابلہ میں دی، ایک اجتہاد ان کا تھا، میں ان دونوں اجتہادوں کو صحیح سمجھتا ہوں، ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں سمجھتا، یہ موقع نہیں کہ میں تاریخی اسباب بیان کروں لیکن میرے نزدیک حالات کے بدلنے کے ساتھ احکام بدلتے ہیں، اُن حالات کے مطابق حضرت حسنؓ کا فیصلہ صحیح تھا، ان حالات کے مطابق حضرت حسینؓ کا فیصلہ صحیح تھا، اور دونوں نے عالی ہمتی سے کام لیا اور کسی نے کمزوری نہیں دکھائی، میں ایک منٹ کے لئے یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ حضرت حسنؓ نے کسی کمزوری کی بنا پر یا کسی بیرونی دباؤ کی بنا پر یہ فیصلہ کیا بلکہ یہ تو وہ فیصلہ تھا کہ جس کی پیش گوئی زبانِ نبوّت نے کی تھی۔

ان ابنی ھذا سید، و — میرا یہ بیٹا سردار ہے، کیا عجب ہے
لعل اللہ ان یصلح بہ — کہ اللہ تعالےٰ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے

بین فئتین من المسلمین[1] دو گروہوں کے درمیان مصالحت کرادے۔

حضرت عمر بن عبد العزیز کی قربانی بھی کسی قربانی سے کم نہیں، وہ جب مدینہ کے گورنر تھے اور حکمراں خاندان کے ایک فرد، تو وہ اپنے اعلیٰ مذاق، نستعلیقی و نفاست پسندی کے لئے ایک ضرب المثل کی حیثیت رکھتے تھے، ان کا فیشن نوجوانوں میں نہ صرف قابل تقلید بلکہ منتہائے کمال سمجھا جاتا تھا، ان کی چال ڈھال کی نقل کی جاتی تھی اور المشیۃ العمریہ کے نام سے اس زمانے کی سوسائٹی میں زبان زد خلائق تھی۔ بلیش قیمت سے بیش قیمت کپڑا بازار سے خرید کر آتا، تو ان کی نظر میں نہ جچتا، لیکن جب خلافت کا بار ان کے کاندھوں پر پڑا تو ان کی زندگی یکسر تبدیل ہوگئی، انھوں نے اپنے اور اپنے قریب ترین اعزہ کی جاگیریں بیت المال کو واپس کر دیں۔ ایک مرتبہ سستے سے سستا کپڑا ان کی پوشاک کے لئے آیا تو یہ کہہ کر انھوں نے واپس کر دیا کہ یہ قیمتی ہیں، ان کے خادم کی آنکھوں میں پرانا زمانہ یاد کر کے آنسو آگئے کہ بازار کے قیمتی کپڑوں کو انھوں نے یہ کہہ کر واپس کر دیا تھا کہ بہت معمولی ہے، کھانے پینے اور گھر کی چیزوں کا معیار انھوں نے اتنا گرا دیا کہ بوریا نشین زاہد بھی اس سے نیچے شاید نہ اتر سکے، احتیاط کا یہ عالم تھا کہ سرکاری شمع جل رہی ہے اور وہ حکومت کا کام کر رہے ہیں کہ ایک دوست باہر سے آتے ہیں، وہ ان سے ان کے علاقہ کے مسلمانوں کے حالات دریافت کرتے ہیں، جوں ہی وہ ان کے بچوں کی خیریت اور گھر والوں کی عافیت پوچھنے لگتے ہیں تو وہ پھونک مار کر شمع گل کر دیتے ہیں اور ذاتی شمع منگواتے ہیں کہ سرکاری شمع اور تیل اس لئے نہیں ہے کہ ذاتی سوالات اور خانگی حالات میں وہ صرف ہوں، میں نے یہ چند مثالیں دی ہیں ورنہ ان کی خلافت کے بعد کی پوری زندگی اس عظیم قربانی کی ایک مثال ہے جو کوئی خدا ترس اور صاحب ضمیر و صاحب ایمان انسان کسی ملک و ملت کے لئے پیش کر سکتا ہے۔

---

[1] صحیح بخاری بہ روایت حضرت ابوبکرؓ۔ بعض روایات میں "وسیصلح اللہ بہ" کے الفاظ آئے ہیں، جس کا مطلب ہے کہ اللہ عنقریب ان کے ذریعہ صلح کروائے گا۔

معاملہ ملّتِ اسلامیہ کی تقدیر کا

یہ میری خوبی ہو یا میری آزمائش ہو، یہ خدا کی نعمت ہو یا میرا امتحان ہو، میں نہیں کہہ سکتا، لیکن شاید اس مجمع میں (ان کے پورے احترام کے ساتھ) کوئی صاحب ایسے موجود نہ ہوں گے جن کو عالمِ اسلام کو اس طرح اور اتنے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہو گا جتنا مجھے، کچھ تھوڑی سی بدقسمتی کچھ تھوڑی سی خوش قسمتی، بدقسمتی اس لئے کہ میں نے اس عالمِ اسلام کو جس طرح دیکھا وہ جگر پر داغ ہے، جگر پر زخم ڈالنے والا ہے، خوش قسمتی اس لئے کہ مجھے مسلمانوں کو قریب سے اچھی طرح دیکھنے کا موقع ملا، اپنے جسم کے ان ٹکڑوں کو دیکھنے کا موقع ملا، بہرحال میں آپ سے یہ کہتا ہوں کہ معاملہ اس وقت پارٹیوں کا نہیں، معاملہ جماعتوں کا نہیں، معاملہ وقتی مصالح کا نہیں، معاملہ ملّتِ اسلامی کی تقدیر کا ہے، ہو سکتا ہے کہ عبادات محفوظ ہوں، معاملات میں بہت سی شکلیں محفوظ ہوں لیکن ملّت دنیا کے سیاسی ترازو میں اپنا وزن نہیں ڈال سکتی بیت المقدس کا مسئلہ ہو، یا فلسطین کا مسئلہ ہو، لبنان کا مسئلہ ہو، یا قبرص کا مسئلہ ہو، آپ دیکھئے کہ پوری ملّتِ اسلامی اس بارے میں کوئی اثر نہیں رکھتی، سلطنتِ عثمانیہ کے بعد عالمِ اسلام کا کوئی ملک اور ملتِ اسلامیہ کا کوئی کنبہ، کوئی خاندان اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ عالمِ اسلامی کے کسی مسئلہ میں اپنا سیاسی وزن ڈال سکے، کچھ فیصل مرحوم نے تھوڑا سا وزن ڈالا تھا اور کچھ ہمت دکھائی تھی لیکن آخر "آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند" آج کوئی اسلامی ملک ایسا نہیں کہ جس کی ناپسندیدگی، جس کا عدم اتفاق اور جس کا احتجاج کسی بڑی طاقت کو ایک سیکنڈ کے لئے بھی اس مسئلہ پر غور کرنے پر آمادہ کر سکے، آپ سب جماعتی مفاد سے بالاتر ہو کر صورتِ حال کا مقابلہ کریں، زمانہ کے چیلنج کو قبول کریں اور اس کا ہمت و جرأت سے سامنا کریں اور اگر خدا کی طرف سے کوئی موقع ملا ہو تو آپ اس موقع سے فائدہ اٹھائیں، اگر کوئی فرد، کوئی جماعت دس فیصد بھی اپنے کو اس کا اہل قرار دے کہ وہ آپ کی کوئی خدمت کر سکے تو اخلاص کا تقاضا یہ ہے کہ اسے موقع دیں کہ وہ اپنی صلاحیت

کا اظہار کرے، مسلمانوں کی تقدیر کی یہ جو لکیریں ہیں، ان کو سامنے رکھئے، یہ نوشتہ دیوار نہیں، نوشتہ تقدیر ہے، آپ کی ذرا سی غلطی، ذرا سی نفسانیت، ذرا سی صوبائی یا لسانی یا طبقہ واری عصبیت، آپس کا انتشار و اختلاف مسلمانانِ عالم کے لئے نقصان دہ ہو سکتا ہے، آج یا کل جب بھی وہ موقع آئے تو آپ سارے مفادات پر ملّت کے مفاد کو مقدم رکھیں اور آپ ہر اس موقع سے، ہر اس موضوع سے، ہر اس مسئلہ سے کنارہ کشی اختیار کریں، جو کسی قسم کا ذہنی انتشار پھیلائے، اگر اس کے لئے آپ کو اختلافی مسائل کو کچھ دنوں کے بالائے طاق رکھنا پڑے تو ضرور رکھیں، فرض اور واجب ہے کہ آپ غیر ضروری بحثوں کو نہ چھیڑیں، اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر بعض دینی دعوتوں نے شروع سے یہ احتیاط برتی ہوتی اور انھوں نے جانبی اور ذیلی بحثوں کو کچھ دنوں کے لئے اٹھا رکھا ہوتا تو آج ان کے لئے راستہ اس سے زیادہ صاف تھا جتنا اس وقت، آپ کو نظر آرہا ہے، لیکن بہر حال یہ انسانی کوششیں ہیں، انسان اپنے علم اور عقل کا مکلف ہے۔

موجودہ صدی کو کسی معتصم کی تلاش

میں سمجھتا ہوں کہ میری تقریر کے مضمرات کو آپ حضرات نے پورے طور پر سمجھ لیا ہوگا، اور اتنا کافی ہے، میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ آپ پورے عالمِ اسلام بلکہ دنیائے انسانیت کے لئے اور حق و انصاف اور عدل و مساوات کے لئے پشت پناہ بنیں اور آپ اس قابل ہوں کہ دنیا کے کسی گوشہ میں آپ کے اخلاقی اثر اور آپ کے احترام میں ظلم نہ ہونے پائے، جیسا کہ ایک بڑھیا عورت پر ظلم ہوا تھا اس نے "وا معتصماه!" کی صدا لگائی تھی اور عباسی خلیفہ معتصم اس کی دادرسی کو پہنچ گیا تھا، آج بھی کوئی ملک اس قابل ہو کہ کوئی مظلوم "وا معتصماه" کہہ سکے، کوئی تو معتصم اس دنیا میں اس صدی میں پیدا ہونا چاہیئے۔ جیسا ایک امام کعبہ کی ضرورت ہے، اور ہم، آپ سب ان کا احترام کرتے ہیں، جیسا کہ آج ایک بڑے عالمِ دین کی ضرورت ہے اور ہم آپ ان کا احترام کرتے ہیں، ویسے حق پسند انصاف شعار

عدل گستر، درد مند، انسان دوست جماعت کی بھی ضرورت ہے'۔ بس میں ان الفاظ پر اپنی بات ختم کرتا ہوں، آپ حضرات کا، خاص طور پر پروفیسر غفور صاحب کا بہت شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے ایسا موقع عطا کیا کہ اگر میں کوشش کرتا اور یہاں میرے احباب بھی کوشش کرتے تو شاید اس آسانی سے یہ موقع فراہم نہیں ہو سکتا تھا، اللہ تعالیٰ ان کو اس کی بہترین جزا عطا فرمائے۔

مِلّی وحدت اور اُس کے تقاضے

یہ تقریر "ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن" کے صدر حکیم محمد سعید صاحب کی دعوت پر "شامِ ہمدرد" کے جلسہ منعقدہ ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل کراچی میں ۱۲ جولائی ۱۹۷۸ء کو کی گئی۔

ابتدا میں حکیم محمد سعید صاحب نے خیر مقدمی اور تعارفی تقریر کی، آخر میں کلماتِ تشکر مولانا جمال میاں صاحب فرنگی محلی (رکن رابطہ عالم اسلامی) نے ادا فرمائے۔

اس شستہ اور شائستہ جلسہ میں ہر شعبۂ زندگی سے متعلق اصحاب اور نمائندہ شخصیتیں تھیں، سامعین میں معتد بہ تعداد ان اصحابِ ذوق کی بھی تھی جو اس تقریر کو سننے کے لئے دور دراز کا سفر کر کے آئے تھے۔

بعد خطبۂ مسنونہ :-

لفظ وحدت میں ایک قسم کی مقناطیسیت ہے :-

حاضرین کرام! میں حکیم محمد سعید صاحب کا بہت ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے ایک ایسے چیدہ اور برگزیدہ مجمع سے خطاب کرنے اور اپنے خیالات پیش کرنے کا ایسا شستہ اور شائستہ موقع مہیا کیا، ایک نو وارد پر (جس کے قیام کے دن گِنے چُنے ہیں اور جو شہر کے اعیان اور معززین اور اہل فکر کے نام و مقام سے پورے طور پر آشنا نہیں ہے) یہ ایک طرح کا احسان ہے کہ اس کے لئے ایک منتخب جگہ پر ایسے ممتاز حضرات جمع کر دیئے جائیں، جن میں سے اکثر سے تنہا مل لینا اور ان کے لئے سفر کرنا بھی حق بجانب تھا لیکن

اس کے ساتھ ساتھ اس سے مقرر یا مہمان کی ذمہ داری میں بڑا اضافہ ہوتا ہے کہ وہ اس نعمت سے کہاں تک فائدہ اٹھا سکے گا اور اس وقت کو کہاں تک کام میں لا سکے گا، اور افکار و خیالات کا ہجوم، جذبات کی فراوانی اور تشکر و امتنان اور احساسِ ذمہ داری کی یہ ملی جلی کیفیت اس کو اپنے دل کی بات مناسب اور موزوں طریقہ پر کہنے کا موقع دے گی یا نہیں؟

اس موضوع کے انتخاب پر بھی حکیم محمد سعید صاحب کو داد دیتا ہوں کہ انھوں نے ایسے دور میں جو بہت سی کشمکشوں، غلط فہمیوں، بدگمانیوں اور مختلف و متضاد محرکات کا دور ہے۔ ایک ایسے معاشرے میں، ایک ایسے ملک میں جو اس خارزار سے گزر چکا ہے، اور پھر یہ خارزار اس کے سامنے ہے، اس موضوع کا انتخاب کیا۔

حضرات! دنیا میں جو لفظ اور جو مفہوم بہت محبوب و مقبول ہیں اور جن کے لفظ و صوت میں ایک کشش اور مقناطیسیت ہے ان میں ایک لفظ "وحدت" بھی ہے۔ انسان کو فطرتاً وحدت سے محبت ہے، اسلئے کہ یہ اس کے دل کا تقاضا، اس کے دل کی آواز اور خدا کی مرضی ہے۔ انسان کو انسانوں کی اس دنیا میں رہنا ہے، اس کو زندگی سے لطف اٹھانا ہے، اس باغِ عالم کو سنوارنا ہے اور اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرنا ہے۔ خدا کی طرف سے جو جوہر اس کو عطا ہوئے ہیں، اس کا اظہار کرنا ہے، اس لیے اس کو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنے کی ضرورت ہے۔

وحدتیں وحدتوں سے ٹکراتی ہیں

لیکن دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ ان وحدتوں نے اب تک زیادہ تر تعمیر کے بجائے تخریب کا کام کیا ہے، یعنی بالکل اپنے مزاج، اپنی فطرت، اپنے دعویٰ اور معانی کے خلاف کردار ادا کیا ہے، وحدت اس لئے تھی کہ لوگوں میں محبت و اتحاد پیدا کرے، خیر سگالی کا جذبہ پیدا کرے، باہمی اعتماد کی فضا پیدا کرے

لیکن وحدتیں وحدتوں سے ٹکرائیں جس طرح وحشتیں وحشتوں سے ٹکرائی ہیں، طاقتیں طاقتوں سے ٹکرائی ہیں، اسی طرح وحدتیں وحدتوں سے ٹکرائیں، حالانکہ کوئی چیز بھی ایک دوسرے سے ٹکرائے، لیکن وحدت کو وحدت سے نہیں ٹکرانا چاہیئے، اس سے بڑھ کر اپنی فطرت سے انحراف اور بغاوت نہیں ہوسکتی کہ وحدت وحدت سے ٹکرائے۔ تخریب تخریب سے ٹکرا سکتی ہے، انتشار انتشار سے ٹکرا سکتا ہے، لیکن جمعیت جمعیت سے ٹکرائے، وحدت وحدت سے ٹکرائے یہ ایک انوکھا تجربہ ہے جس سے ہماری انسانی تاریخ داغدار بلکہ شرمسار ہے، یہ ایک دل خراش اور طویل داستان ہے۔

وجہ یہ ہے کہ اس کا تعلق وحدتوں کی بنیاد سے ہے۔ وحدت کس بنیاد پر ہے؟ اگر وحدت کسی منفی بنیاد پر ہے، اگر وحدت کسی جارحانہ جذبہ پر ہے، اگر وحدت احساس برتری پر ہے، اگر وحدت تحقیرِ انسانی پر ہے، اگر وحدت ہوسِ ملک گیری، برتری اور سروری حاصل کرنے کے لئے ہے تو ایسی وحدت کو کسی اور وحدت کو گوارا نہیں کرنا چاہیئے، کہ ایک نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکیتں، اس لئے جب آپ انسان کی تاریخ پڑھیں گے، کسی قوم و مذہب کی تاریخ پڑھیں گے تو آپ کو یہ پوری تاریخ ایک رزمیہ جنگ کی ایک مربوط داستان نظر آئے گی، جس میں خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں، انسانوں کے سروں کے مینار بنائے جارہے ہیں، ملکوں کے چراغ گل کئے جارہے ہیں، کھیتیاں جلائی اور پامال کی جارہی ہیں، بلکہ تہذیبیں پامال کی جارہی ہیں۔ اور جب ان کے وجوہ واسباب کا (فلسفۂ تاریخ کی مدد سے) آپ سراغ لگائیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ایک ایسی وحدت نے نشو ونما پایا تھا جو دوسری وحدت کو فنا کرنے میں اپنی زندگی کا راز سمجھتی تھی۔

محض وحدت کوئی معنویت نہیں رکھتی

وحدت کا خالی لفظ بالکل کافی نہیں۔ اب قوموں کے تجربے نے نوعِ انسانی کے مسلسل اور

طویل تجربے نے بتادیا کہ محض وحدت کوئی معنویت نہیں رکھتی اور کسی بات کی ضمانت نہیں ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وحدت کس بنیاد پر ہے؟ اس وحدت کی اساس کیا ہے؟ وحدت کے مقاصد کیا ہیں؟

نوع انسانی کی تاریخ میں سب سے پہلی جو وحدت نظر آتی ہے وہ گھرانوں کی وحدت ہے، قبیلہ کی وحدت ہے، قوم و نسل کی وحدت ہے، نام و نسب کی وحدت ہے، پھر اس کے بعد آگے بڑھکر دنیا نے جب ذرا اور ترقی کی تو زبان کے اشتراک کی وحدت ہے جسے ہم لسانی وحدت کہتے ہیں، پھر تہذیبی و ثقافتی وحدت ہے، ان وحدتوں میں سب سے زیادہ جس وحدت سے امید ہونی چاہئے تھی وہ تہذیبی و ثقافتی وحدت ہے کہ تہذیب و ثقافت کو مردم آزاری اور آدم بیزاری سے کیا تعلق؟ تہذیب و ثقافت کے معنی یہ ہیں کہ غلط فہمیاں رفع ہوں، آدمی، آدمی کو سمجھے، اس کے ساتھ انصاف کرے، اس کی مجبوریاں معلوم کرے، اس کی کمزوریاں معلوم کرے، اس کے لئے اپنے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو، اس کے ادب و شاعری سے واقفیت کا ذوق پیدا ہو، تہذیب و ثقافت کی وحدت کے اندر جارحیت کا پہلو اور اس کے اندر انسانوں کو ذلیل کرنے یا انسانی تہذیب کے خلاف حملہ آور ہونے کا پہلو تو ہونا ہی نہیں چاہیئے تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ انسانوں کی زندگی مختلف قسم کے تناقضات (CONTRADICTIONS) کا مجموعہ ہے، اس کو سمجھنا بڑا مشکل ہے، ہمارا موجودہ علم نفسیات بھی اس کے لئے کافی نہیں ہے۔ انسان کے اندر ایک دوسرا انسان پیدا ہو جاتا ہے، انسان کے کچھ ایسے مقاصد بن جاتے ہیں جو دوسرے انسانوں کے لئے مہلک ہوتے ہیں۔ ان مقاصد کی تعمیر بعض اوقات دوسرے انسانوں کے مقاصد کے ملبہ پر ہی ہو سکتی ہے، اس کے کھنڈروں پر ہی یہ عمارت تعمیر ہو سکتی ہے۔ کوئی فلسفۂ زندگی ایسا ہو جو انسان کی تباہی اور انسان کے مفتوح ہونے اور شکست کھانے ہی سے بنتا، ابھرتا، پھلتا اور پھولتا ہو تو اس کا کوئی علاج نہیں۔

وحدت کا اسلامی تصور

اسلام نے ان مصنوعی وحدتوں کے معاملے میں دو حقیقی وحدتوں کو تسلیم کیا اور ان کی دعوت دی ہے۔

یہ دنیا کی معصوم ترین، غیر مضر ترین، مثبت اور تعمیری وحدتیں ہیں، ایک وحدتِ انسانی اور ایک وحدتِ ایمانی۔ وحدتِ انسانی تو یہ کہ پوری نسلِ انسانی ایک آدم کی اولاد ہے، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں ایسے معجزانہ الفاظ میں اس پر مہر لگادی کہ اس سے زیادہ انسانی مساوات کا کوئی منشور یا چارٹر نہیں ہو سکتا، آپ نے فرمایا کہ "ان ربکم واحد وان اباکم واحد" اے انسانو! تمہارا رب بھی ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے، وحدتِ اب اور وحدتِ رب دو وحدتیں ہیں جو ہر انسان کو ملی ہیں۔ اس کے جسمانی وجود کا آغاز ایک انسانی وجود سے ہوتا ہے، بڑا ہو، چھوٹا ہو، کسی زبان کا بولنے والا ہو، کسی سطح کا انسان ہو، سب کا سلسلۂ نسب ایک انسان پر ختم ہوتا ہے اور وہ نسلِ انسانی کے باوا آدم ہیں اور اِنَّ رَبَّکُم واحد تمہارا پیدا کرنے والا اور پرورش کرنے والا بھی ایک ہے۔ ان دو مختصر لفظوں میں وحدتِ انسانی کا وہ اعلان کیا گیا ہے جس سے زیادہ وسیع، عمیق اور جس سے زیادہ قابلِ فہم کوئی اعلان نہیں ہو سکتا یہ دونوں وحدتیں جو انسان کو ملی ہیں انسان کو ایک دوسرے سے منسلک اور وابستہ کئے ہوئے ہیں۔ نسلِ انسانی کا مورث ایک اور نسلِ انسانی کا خالق، مربی اور رازق ایک، اس لئے ہر شخص ایک دوسرے کا بھائی ہے اور دو رشتوں سے بھائی ہے۔ ایک باپ کے رشتہ سے اور ایک پیدا کرنے والے کے رشتہ سے، باپ کا ذکر پہلے اس لئے کیا کہ یہ حقیقت سب سے زیادہ عام فہم ہے اور اس کو سب مانتے ہیں، زبانِ نبوت نے اعلان کیا کہ نسلِ انسانی کا مورثِ اعلیٰ ایک ہے، اس کا پیدا کرنے والا اور اس کی پرورش کرنے والا بھی ایک ہے اور اس کی پرورش کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ وہ وحدتِ انسانی ہے جس کا اعلان حجۃ الوداع کے موقع پر کیا گیا۔ یہ ایک عالمگیر خطبہ تھا جس کی مخاطب پوری نوعِ انسانی تھی یہ ایک شہادت تھی جو ایک نبی دے رہا ہے اور ایک طرح کا اعلان تھا جو خاتم الانبیاء کر رہے تھے۔

ایک نئی وحدت

چھٹی صدی مسیحی میں ایک نئی وحدت کی بنیاد ڈالی گئی، اس وحدت کی بنیاد اللہ کی وحدانیت کے

عقیدہ، نوعِ انسانی کے ہمدردی کے جذبہ، عدل و مساوات کے اصول اور انسانوں کی خدمت کے عزم و ارادہ پر تھی۔

اس جماعت کی جس وقت مدینہ طیبہ میں تشکیل ہو رہی تھی تو وہ مٹھی بھر جماعت تھی، مہاجرین جب مکہ معظمہ سے نکلے اور مدینہ پہنچے تو ان کو وہاں کے اصل باشندوں اوس اور خزرج سے ملایا گیا، اور ان دونوں کے درمیان مواخات (بھائی چارہ) کا رشتہ قائم کیا گیا۔ اس لئے کہ یہ غریب الدیار تھے یہ کہاں ٹھہرتے، ان کا گھر بار نہیں تھا۔ یہ ایک بالکل نیا رشتہ اور نئی برادری تھی جس کی بنیاد محض عقیدہ و مقصد پر تھی۔ آپ میں سے جو لوگ سیرت پر گہری نظر رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اس کی بنیاد تہذیب کی وحدت اور معاشرت کی وحدت پر بھی نہیں تھی، زبان کی وحدت تو تھی لیکن مکہ اور مدینہ کی زبان اور لہجوں میں اتنا اختلاف تھا جو ایک دوسرے سے دور رکھنے کے لئے کافی تھا۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ تھوڑے فاصلہ پر زبان بدل جاتی ہے اور اس میں پھر وہ عصبیت پیدا ہو جاتی ہے جو مستقل دو زبانوں کے بولنے والوں کے درمیان ہوتی ہے، جس کا تجربہ، جیسا کہ پاکستان میں ہوا میں سمجھتا ہوں دنیا کے کم ملکوں میں ہوا ہوگا۔

مکہ اور مدینہ کے معاشرہ اور تمدن کو عام طور پر سیرت کا مطالعہ کرنے والوں نے جیسا متحد سمجھا ہے، صحیح نہیں ہے، سیرت کا نیا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ مکہ اور مدینہ کے معاشرے اور تہذیب و تمدن میں خاصا فرق تھا اور مکہ کے قبیلۂ قریش میں اچھا خاصا احساس برتری (superiority complex) پایا جاتا تھا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ جس وقت بدر میں تین قریشی سورما عتبہ، شیبہ اور ربیعہ آئے تو انھوں نے دعوتِ مبارزت دی کہ ہمارے مقابلہ میں کسی کو آنا چاہیے، تین انصاری نکل کر گئے بعض روایتوں میں ہے کہ انھوں نے کہا کہ تم شریف آدمی ہو لیکن ہمارے جوڑ کے .... جو لوگ ہیں ان کو بھیجو، اس سے ان کی قبائلی نخوت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے برابر کسی کو نہیں سمجھتے تھے، پھر مدینہ طیبہ کے معاشرہ کے جو عناصر تھے، ان میں بہت اہم عنصر بلکہ جو Dominate کرتا تھا وہ یہودیوں کا عنصر تھا، یہودی اپنے ساتھ ایک تہذیب رکھتے تھے،

زبان رکھتے تھے اور تنہا وہ جزیرۃ العرب میں ایک ایسی ترقی یافتہ قوم تھی جن کے اپنے مدارس تھے جن کو "مِدراس" کہا جاتا تھا۔ وہ ان سب لوگوں کو اُمی کہتے تھے جیسا کہ قرآن مجید میں ان کا قول خود آتا ہے لیس علینا فی الامیین سبیل (یعنی یہ اَن پڑھ لوگ ہیں ان کو نقصان پہنچانے یا دھوکہ دینے سے کوئی گناہ نہیں ہوتا) اور یہ آج بھی یہودیوں کا قول ہے۔ اور عقیدہ ہے اور اس کے لئے ان کے یہاں خاص لفظ ہے Goyim جس کے معنی غیر مہذب اور اجنبی کے ہوتے ہیں۔

بہرحال اگر آپ تفصیل کے ساتھ سیرت کی کتابوں کا مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مدینہ کا معاشرہ اور مکہ کا معاشرہ باوجود لسانی وحدت کے اور اوپر جا کر نسبی وحدت کے بھی ایک دوسرے سے کتنا مختلف ہو چکا تھا۔ الگ الگ ماحول میں ارتقاء کے منازل طے کرنے کی وجہ سے گویا وہ دو ملکوں کے معاشرے تھے اس لئے جب وہ مکہ سے مدینہ ہجرت کر گئے تو اس کا بڑا اندیشہ تھا کہ یہ شیر و شکر نہیں ہو سکیں گے یعنی ایک مزاج پیدا نہ کر سکیں گے، جیسا کہ کسی معجون کے اجزاء باہم مل کر کے ایک مزاج پیدا کرتے ہیں (اور یہ طبی اصطلاح میں حکیم صاحب کی رعایت سے بول رہا ہوں) تو یہ اندیشہ تھا کہ یہ جو اسلامی معجون بن رہا ہے، اس کے یہ دو جز مہاجرین اور انصار ایک دوسرے میں اس طرح تحلیل ہو سکیں گے، اپنی شخصیت سے اس طرح دستبردار ہو سکیں گے کہ ایک مشترکہ مزاج پیدا کر لیں؟ دوا جب مفید ہوتی ہے جب وہ ایک مشترک مزاج پیدا کر لے۔ اگر ہر ایک جز کا مزاج قائم رہے تو وہ مفید نہیں ہو سکتی۔

مسئلہ صرف مہاجرین اور انصار ہی کا نہ تھا خود انصار کے دو بڑے قبیلے اوس اور خزرج بھی تھے جو مستقل دو قوموں اور حریفوں کی طرح ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آرا اور نبرد آزما رہ چکے تھے۔ بعاث کی جنگ (جو ہجرت کے پانچ سال پہلے پیش آئی تھی) ان خون آشام جنگوں کے سلسلہ کی آخری کڑی تھی جس میں ایک نے دوسرے کو قتل کیا تھا، ہر قبیلہ کے پاس اپنے فخریہ کارناموں کی ایک تاریخ اور مستقل منظوم شاہ نامے بنے ہوئے تھے۔ یہودی ان دونوں قبیلوں کے مسلمان ہو جانے کے بعد بھی

مشترک مجلسوں میں ان واقعات کو یاد دلاکر اور ان اشعار کو پڑھ کر ان کے مندمل زخموں کو ہرا اور ان کی جاہلی نخوت کو زندہ کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ سیرت کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک ایسے ہی موقع پر (یہودی سازش کے نتیجہ میں) قریب تھا کہ تلواریں نیام سے نکل آئیں اور یہ دونوں قبیلے ایک دوسرے سے گتھ جائیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عین موقع پر تشریف لے آئے اور آپ نے آگ کے شعلوں کو ایمان اور محبت اسلامی کے پانی سے سرد کر دیا اور فتنہ بھڑکنے نہیں پایا۔[1]

بہرحال اس کا پورا امکان تھا کہ بجائے اس کے کہ ایک نئی طاقت ابھرے، ایک نیا انتشار برپا ہو جائے، اور اس کے بہت سے اسباب تھے، جیسا کہ عرض کیا گیا، خود یہودیوں کا وجود سب سے بڑا عامل (FACTOR) تھا تخریب کا۔ تخریب کی ان کے اندر حقیقی صلاحیت ہے، دنیا کی کم قوموں میں ہے، اور آج تک ان کا یہ جوہر باقی ہے، اس لئے اس کا بھی خطرہ تھا کہ وہ ایک دوسرے کے درمیان کوئی رقابت پیدا کر دیں گے، اور ایک کو دوسرے سے ٹکرا دیں گے۔

مکہ معظمہ کی زندگی کا دارومدار تجارت پر تھا اور مدینہ کی زندگی کا دارومدار زراعت اور باغبانی پر تھا، یہ دونوں شہروں کی جغرافیائی خصوصیات کا نتیجہ تھا۔ گھر کی معاشرت میں بھی فرق تھا جس کی طرف حضرت عمرؓ نے بھی ایک مرتبہ اشارہ کیا تھا۔[2]

عقیدہ اور مقصد کا اشتراک

اسکے پہلے مجھے معلوم نہیں کہ ایسے منظم اور واضح طریقہ پر دو متباین عناصر کے درمیان کسی عقیدہ اور مقصد کے اشتراک پر ایک نئی برادری کی بنیاد ڈالی گئی ہو، یہ برادری تھی ان ایمان لانے والوں کی جو

---

[1] ملاحظہ ہو سیرت ابن ہشام حصہ اول ص۵۵۵ [2] کتب صحاح میں حدیث ایلاد

جو وحدت انسانی پر اور وحدتِ ربانی پر یقین رکھتے تھے، اور وحدتِ عقیدہ اور وحدتِ مقصد پر جمع ہوئے تھے، ایک نئی طاقت اس دُنیا کو بچانے کے لئے پیدا کی جارہی تھی۔

عددی لحاظ سے قلیل و حقیر، مقاصد کے لحاظ سے عظیم و جلیل

یہ چھوٹی سی برادری جو وجود میں آرہی تھی اس کی حقیقت کیا تھی؟ اس کے افراد کی تعداد کیا تھی؟ قرآن کریم نے اس کی تصویر خود کھینچی ہے۔

واذکروا اذا انتم قلیل مستضعفون فی الارض تخافون ان یتخطفکم الناس (وہ دن یاد کرو جب تم مٹھی بھر تھے، انگلیوں پر گنے جانے کے قابل تھے انتم قلیل مستضعفون فی الارض اور تمہیں کوئی خاطر میں نہیں لاتا تھا، تم کسی شمار و قطار میں نہیں تھے، تم ڈرتے تھے کہ جس طرح چیل جھپٹا مار کر گوشت کا ٹکڑا لے جاتی ہے اسی طرح تمہارے دشمن تم کو اڑا کر نہ لے جائیں اور تم کچھ نہ کر سکو۔

حالت تو یہ تھی لیکن ان مسلمانوں کو پوزیشن کیا دی گئی؟ ان کو مقام کیا عطا کیا گیا؟ جب بھی میں اس آیت کو پڑھتا ہوں تو حیرت میں ڈوب جاتا ہوں، اس نئی برادری، نئی وحدت کو کیا فرض انجام دینا تھا، اس کا کام کتنا مشکل، نازک اور عظیم تھا اور خدا کی نگاہ میں اس کی کیا وقعت تھی خدائے تعالیٰ فرماتا ہے إلّا تفعلوہ تکن فتنۃ فی الارض وفساد کبیر۔ اے مہاجرین و انصار اگر تم نے اس نئی وحدت کی بنیاد نہ ڈالی اور اس وحدت کو مستحکم نہ کیا تو تکن فتنۃ فی الارض وفساد کبیر زمین میں فتنۂ عظیم اور فسادِ عظیم برپا ہوگا۔ .... یہ الفاظ سنتا تو حیرت کرتا کہ اس جماعت کی حقیقت کیا ہے بتیس دانتوں میں ایک زبان، اس سمندر میں اس قطرہ کی کیا حقیقت تھی، یہ مہاجرین و انصار اگر وحدت قائم کر بھی لیتے تو اس فتنۂ کبریٰ اور فسادِ عظیم کو روکنے کی وہ کیا صلاحیت رکھتے تھے؟ لیکن خدا کو اس وحدت سے جو کام لینا تھا اور یہ وحدتِ انسانی انسانی تہذیب

اور اس دنیا کی بقا کے لئے جتنی ضروری تھی اس کی بنیاد پر اسکو یہ تمغہ یہ اعزاز عطا کیا گیا، سوائے ان لوگوں کے جو خدا کو قادر مطلق سمجھتے تھے اور یہ جانتے تھے کہ یہ برادری جو قائم ہو رہی ہے اپنے اندر کیا جوہر رکھتی ہے۔ عددی حیثیت سے یہ کتنی قلیل اور حقیر لیکن اپنے (MARIT) جوہر و صلاحیت کے لحاظ سے کتنی قیمتی، باوزن اور مؤثر ہے، جو لوگ دیکھتے کہ اس کے اندر کیا جوش و جذبہ ہے، اس کے اندر انسانیت کے لئے کس قدر سوز و گداز بھرا ہوا ہے، اس کے افراد کی راتیں کس تپش میں، ان کے دن کس خلش میں گزرتے ہیں اور ان کو اپنی جان اور اپنی اولاد کس قدر بے حقیقت معلوم ہوتی ہے، نوعِ انسانی کو بچانے کے لئے دنیا میں ہدایت کو عام کرنے اور انسان کو انسان سے ٹکرانے سے بچانے کے لئے ان میں کتنی بے چینی و بے قراری ہے، وہی اس آیت کی حقیقت کو سمجھ سکتے تھے، ورنہ اس وقت کے سیاسی فلسفے اور تہذیب و تمدن کے ماحول میں یہ بات سمجھ میں نہ آنے والی تھی کہ ایک ایسی چھوٹی جماعت کو یہ اعزاز دیا جارہا ہے۔ إلّا تفعلوه تكن فتنة في الارض وفساد كبير تم نے یہ برادری قائم نہ کی، اس وحدت کو مضبوط نہ کیا تو تکن فی الارض فتنۃ و فساد کبیر فتنہ و فساد کے شعلے دنیا میں اٹھیں گے اور پوری دنیا کو جلا کر خاکستر بنا دیں گے۔ اس جلتی ہوئی آگ کو جس نے ساری دنیا کو اپنے لپیٹ میں لے لیا تھا، آپ ساتویں صدی مسیحی کے نقشے میں دیکھیں، جغرافیائی نہیں بلکہ ان کی باہمی آویزشوں اور ان کی جنگوں کے نقشہ میں ان کے احساس برتری کا اور ان کے نشۂ قوت کا دنیا پر جو اثر پڑا تھا، اس کو اقبال نے اپنے خاص انداز میں اس طرح بیان کیا ہے ؎

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں ۔۔۔ سو بار ہوئی حضرت انساں کی قبا چاک

تاریخ امم کا یہ پیام ازلی ہے ۔۔۔ صاحب نظراں! نشۂ قوت ہے خطرناک

اس سیلِ سبک سیر و زمیں گیر کے آگے ۔۔۔ عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

چھوٹی سی برادری پر سارے عالم کا بوجھ

اس نشۂ قوت نے دنیا پر کیا اثر ڈالا تھا اس کے مقابلہ میں یہ ایک جو چھوٹا سا پودا تیار ہو رہا تھا، مدینہ کی سرزمین میں چھوٹی سی برادری قائم ہو رہی تھی۔ ایک نئی وحدت کی بنیاد پڑ رہی تھی، اس پر سارے عالم کا بوجھ ڈال دیا گیا۔ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ اگر تم نے اس وحدت کے استحکام میں، وحدت کی جڑوں کو گہرا کرنے میں اور اس وحدت پر یقین کرنے میں، اس وحدت سے عشق و محبت کا تعلق رکھنے میں اور انسانیت کے درد کی آگ اپنے دلوں میں محسوس کرنے میں کمی کی، اگر تم نے اپنے مفاد کو دیکھا، اپنے جماعتی مفاد کو دیکھا، انفرادی مفاد کو دیکھا تو پھر دنیا میں فتنہ و فساد کا سیلاب رواں ہوگا اور پھر انسانیت کی قسمت میں سوائے تباہی و بربادی کے کچھ نہیں ہوگا۔ میں جب بھی ان الفاظ کو پڑھتا ہوں تو لرز جاتا ہوں کہ کتنی چھوٹی اور کمزور جماعت پر کتنا بوجھ ڈال دیا گیا، جو اپنی تعداد میں کمی اور اپنی بے حیثیتی میں اتنی چھوٹی تھی کہ شاید اسکو اگر خوردبین سے نہیں تو نگاہِ دوربیں سے دیکھنے کی ضرورت تھی۔ اسی جماعت کے متعلق کہا جا رہا ہے اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ کہ دیکھو خبردار اگر تم نے اسی نئی وحدت کے مستحکم کرنے میں ذرا بھی کمزوری دکھائی تو پھر انسانیت کی قسمت میں سوائے شقاوت اور بدبختی کے کچھ لکھا نہیں، پھر تو یہ وحدتیں نسلِ انسانی کو کھا جائیں گی، یہ وحدتیں نہیں وحشتیں ہیں۔ نوعِ انسانی کی تفریق کی سازشیں ہیں، ان میں سے ایک حیات دوسرے کے لیے پیامِ موت بن گئی ہے، ایک مجموعۂ انسانی کی حیات سینکڑوں مجموعہائے انسانی کے لئے موت کا پیغام ہے، اسی وحدت کا تسلسل اور نتیجہ ہم اور آپ ہیں۔ آج بھی دنیا میں وحدتوں کے نام سے وحشتیں کارفرما ہیں آج بھی وحدتوں کے نام سے تفرقے کارفرما ہیں، آپ جس سے پوچھیں گے وہ اس کی تعریف وحدت میں کرے گا، یہ ملک ہے، یہ فلاں یونٹ ہے' یہ فلسفہ' وہ فلسفہ' یہ ازم' وہ ازم لیکن کوئی وحدت کسی دوسری وحدت کی روادار نہیں، ہر وحدت نے اپنی زندگی کو اس کے لئے شرطِ حیات قرار دیا ہے کہ اس کے علاوہ

ساری وحدتیں ختم ہوں، اس لئے اگر کوئی وحدت دنیا کے لئے رحمت کا پیام رکھتی ہے تو وہ وحدتِ انسانی اور وحدتِ ربانی ہے۔

زبان کی وحدت کے تباہ کن نتائج

یہ زبان جو بڑی معصوم چیز ہے جس سے پھول جھڑتے ہیں، یہ زبان جو دلوں کو ملانے کے لئے، دل کو خوش کرنے کے لئے، محبت کے گیت سنانے کے لئے، انسان کو قریب کرنے کے لئے اس کو آواز دینے کے لئے ہے یہ زبان جو جذبات محبت کی ترجمانی کے لئے استعمال کی گئی، رازہائے فطرت کو عیاں کرنے کے لئے استعمال کی گئی، یہ زبان جس نے بارہا انسان کو مست کردیا، بچھڑے ہوؤں کو ملادیا، ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ دیا جس نے محبت کے دریا بہائے، یہی زبان لاکھوں انسانوں کی بربادی کا باعث ہوئی ہے یہ زبان وہ ہے جس کے نام پر زبان والے قتل کئے گئے، جو خود زبان رکھتے تھے جن کے پاس ویسی ہی فطرت کی دی ہوئی زبان تھی جیسی ان قاتلوں کے پاس تھی، لیکن یہ زبان کی نام نہاد وحدت، زبان کا بڑھا ہوا عشق، زبان کی عصبیت نے ان انسانوں کو جن کی زبان سے محبت کے سوا، پیار کے سوا کوئی لفظ نہیں نکلا، جنھوں نے خدا کی یاد میں پوری پوری راتیں بسر کردیں، خاک و خون میں تڑپایا ہے، یہی زبان جب ایک ایسی مصنوعی وحدت کی بنیاد بنتی ہے جس کی اللہ کی طرف سے کوئی سند نہیں ما انزل اللہ بہا من سلطان تو وہ پیغمبروں کی محنتوں پر پانی پھیر دینے والی اور تمام دنیا کے اصلاحی کاموں پر خطِ تنسیخ پھیر دینے والی تخریبی طاقت بن جاتی ہے۔ وہ تہذیب کے ذخیروں کو آن کی آن میں برباد کردیتی ہے، اس زبان کی وحدت نے دنیا میں وہ گل کھلائے کہ انسان بالکل تصویرِ حیرت بن گیا ہے۔ آپ کو اس کا خوب تجربہ ہے اور یہ خطرہ اب بھی موجود ہے کہ کوئی چالاک انسان زبان کو بنیاد بنا کر اس ملک میں تفریق و انتشار اور "حمیتِ جاہلیہ" کا زہر پیدا کردے اپنے سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لئے اسکو کام میں لائے، یہ زبان آج بھی وہ تخریبی کردار ادا کرسکتی ہے

جو سیزر، قیصر اور چنگیز کی تلواروں نے انجام دیا۔

تہذیب کی وحدت کا انجام

ایسی تہذیب، جس کا پیغام ہی یہی ہے کہ انسان مہذب ہو، انسان کے اندر اپنی کمزوریوں کا احساس ہو، دوسروں کے کمالات کا اعتراف ہو، جو ہر جمال، ہر حسن پر فریفتہ ہو، جو فنِ تعمیر کے ہر نمونہ پر تحسین اور آفرین کے پھول برسائے، جو اچھے شعر پر مست ہو جائے، جو ہر قوم کی ذہانت پر اور اس کی طباعی اور صناعی کے ہر نمونہ پر مسرور ہو، اس کو اپنی ملکیت سمجھے، تہذیب کا خاصہ تو یہ تھا کہ انسان کے ہر کارنامے کو اپنا سمجھا جائے، اس سے اپنے تعلق اور اپنی قدر کا اظہار کیا جائے، جب تہذیب خدا کی رہنمائی اور پیغمبروں کی رہنمائی سے محروم ہو جاتی ہے تو وہ تہذیب تہذیب نہیں رہتی۔ وہ اپنے حق میں خواہ تہذیب ہو، دوسروں کے حق میں تعذیب بن جاتی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ تہذیبیں تہذیبوں سے کس طرح ٹکرائیں اور کلچر، کلچر سے ٹکرائے؟ اب یہ طلسم ٹوٹ چکا ہے کہ وحدت کافی ہے، اگر اس وحدت میں ان دو وحدتوں یعنی وحدتِ ایمانی اور وحدتِ انسانی میں سے کوئی وحدت نہ ہو تو یہ وحدتیں بجائے خود ایک معبود بن جائیں گی اور پھر بجائے اس کے کہ ان سے اپنے دل کے ارمان نکالے جائیں، اپنا شوق پورا کیا جائے، اور ان وحدتوں سے تفریح کا سامان مہیا کیا جائے ان سے اپنے جذبہ کی تسکین کی جائے، بجائے اس کے وہ ایک مذہب بن جاتی ہیں، ایک ایسا نظام جو دوسروں پر مسلط کیا جاتا ہے، یہ تہذیبیں انسانوں کی غارت گری کا سامان بنتی ہیں۔ یہ دنیا کا تجربہ ہے جو بارہا ہو چکا ہے۔

دو عظیم جنگوں کے اسباب

آپ میں سے بہت سے ایسے حضرات ہوں گے جنھوں نے ۱۴ء اور ۳۹ء کی پہلی اور دوسری جنگ

عظیم کو دیکھا ہوگا، بعض ایسے ہوں گے جنھوں نے صرف دوسری جنگ عظیم کو دیکھا ہوگا۔ یہ جنگیں، یہ قتل و غارت گری کس بات کا نتیجہ تھی؟ کیا یہ صحیح مقاصد کا غلط مقاصد سے ٹکراؤ تھا؟ کیا اس لئے کہ کسی قوم کسی ملک نے کوشش کی کہ دنیا کو صحیح راستہ پر لائے؟ جو جرائم ہو رہے ہیں، جو بے راہ روی ہے اس سب کی اصلاح سے ہمیں کوئی بحث نہیں مقصد صرف یہ ہے کہ یہ سب ہماری نگرانی اور ہماری سرپرستی میں ہو، دنیا کا جو موجودہ نقشہ ہے، اس میں کوئی خرابی نہیں، لیکن اس پہ جو اجارہ داری فلاں قوم کی قائم ہے، اس کی بجائے ہماری ہونی چاہیئے، مثلاً پہلی جنگ عظیم کیا تھی؟ جرمنی کو یہ احساس پیدا ہوا کہ دنیا کی منڈیوں پہ، تجارت گاہوں پر اور وسائل و ذخائر پر برطانیہ کا قبضہ ہے۔ اس پہ بہت دنوں سے برطانیہ کا تسلط چلا آرہا ہے، اب ہمارا قبضہ ہونا چاہیئے، ہماری سیاسی پارٹیوں کا بھی یہی مزاج ہے۔ میں نے ہندوستان میں کھلے طریقوں پر ان جلسوں میں جن میں ہندو بھائی بھی شریک ہوتے تھے، بارہا کہا کہ آج کی سیاسی پارٹیوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں...... کہ یہ خرابیاں دور ہوں بلکہ صرف یہ ہے (چاہے زبان سے نہ کہیں) کہ یہ خرابیاں ہماری نگرانی میں ہونی چاہئیں اور اب تجربہ کر کے دیکھ لیجئے۔ آپ صرف اپنا اختیار ان کی طرف منتقل کر دیجئے، میں آپ سے کہتا ہوں ذرا بھی اس نقشہ میں تغیر و تبدل نہ ہوگا۔ اصولی اختلاف کوئی نہیں، اخلاقی بنیاد پر کوئی اختلاف نہیں۔ آپ اونچی سطح پر جائیں تو یورپ کی قومیں جو کئی بار ایک دوسری سے برسر جنگ رہ چکی ہیں ان کے نزدیک اصول و بے اصولی، مسیحیت اور غیر مسیحیت، ظلم و انصاف کا اختلاف یا انسانی زندگی کے نقشہ کی تشکیل کا مسئلہ نہیں بلکہ صرف یہ کہ دنیا کو ہمارے جھنڈے کے نیچے آنا چاہیئے اور معاف کیجئے گا، ہمارے مختلف مشرقی ملکوں کی سیاسی پارٹیوں کے سوچنے کا طریقہ بھی یہی ہے۔ اس سے کوئی خاص خلش نہیں تکلیف نہیں کہ انسانی طاقتیں ضائع ہو رہی ہیں، نوجوانوں کے اخلاق خراب ہو رہے ہیں، نظام تعلیم غلط ہے، درست ہونا چاہیئے بلکہ سب کی توانائیاں حصول اقتدار میں صرف ہو رہی ہیں۔

پاکستانی مسئلہ

پاکستان کے مسلمانوں کا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ آپ تنہا اس ملک میں وحدت کے علمبردار ہیں ، بلکہ اس وقت دنیا کے سیاسی نقشے میں اس اسلامی وحدت کے دعویدار ہیں اور اس وحدت کو DEMONSTRATE کرنے والے ہیں ۔ اگر آپ اس وحدت سے دستبردار ہو جائیں گے یا آپ کے ملک میں لسانی جھگڑے یا تہذیبی جھگڑے یا پرانی یا علاقائی تہذیبوں کے احیاء کا فتنہ سر اٹھائے گا ، مثلاً یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ ہماری قدیم تہذیب ، مسلمانوں کی آمد سے پہلے کی تہذیب کو زندہ کیا جائے تو پھر اس ملک کا خدا ہی حافظ ہے ۔ (اس معنے میں کہ اس ملک کی خیریت نہیں) اس لئے کہ اس ملک کے مختلف عناصر ترکیبی کو جو چیز مربوط کرتی ہے وہ وحدتِ ایمانی ہے ، وحدتِ عقیدہ ہے ، وحدتِ اسلامی ہے ، اب اگر یہ نئی مصنوعی وحدتیں ، یہ انسانوں کے تراشے ہوئے بت جس کو اقبال کہتا ہے ؎

بتانِ رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ ایرانی رہے باقی نہ تورانی نہ افغانی

یہ بتانِ رنگ و بو اپنا اثر رکھتے ہیں اور اپنے عمل میں آزاد ہیں تو اس ملک کے لئے خطرہ باقی ہے ترکی میں وسط ایشیائی تہذیب کے احیا کا جذبہ پیدا ہوا تھا جس کا داعی "ضیاء گوک الپ" تھا اور اس کے سب سے بڑے پیرو کمال اتاترک تھے ۔ اسی طرح ایران میں بھی ماقبلِ اسلام تہذیب کے احیاء کی کبھی کبھی باتیں ہوتی ہیں ۔ آپ کے اس ملک میں کسی صوبہ میں قدیم تہذیب کے احیاء کا کوئی جذبہ پیدا ہو جائے اور تحریک چل جائے تو پھر پاکستان کے لئے بڑا خطرہ ہے ۔ میں یہ عرض کروں گا کہ صرف وحدتِ ایمانی اور وحدتِ اسلامی ہی میں ہمارے لئے پناہ ہے ، اس کے علاوہ اگر کوئی "وحدت" پیدا ہوئی تو اس ملت اور ملک کا شیرازہ منتشر کر دیگی ، طاقتیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں گی اور جاہلی عصبیتیں دوبارہ زندہ ہو جائیں گی

جس کو اسلام نے ختم کیا تھا۔

اذ جعل الذین کفروا فی قلوبھم الحمیۃ حمیۃ الجاھلیۃ — جب اہلِ کفر نے اپنے دلوں میں حمیت حمیتِ جاہلیہ جاگزیں کر لیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شاید کسی مسئلہ اور کسی موقع پر اتنی سخت زبان استعمال نہیں کی، مجھے آپ یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ زبان نبوت سے شاید پہلی مرتبہ ایسے سخت لفظ نکلے جو اس جاہلی عصبیت کے کے بارے میں آپ کی زبان سے نکلے تھے، اس لئے کہ آپ کو اللہ نے جو بصیرت عطا فرمائی تھی اور وحیِ الٰہی کے علاوہ جو اللہ تعالیٰ نے آپ کا شرحِ صدر فرمایا تھا اور آپ پر حقائق منکشف کر دیئے تھے، اب قوموں اور ملتوں کی تاریخ کو آپ کے سامنے تھی، اس کی بنا پر سب سے بڑا فتنہ آپ اسکو سمجھتے تھے۔ اسی عصبیت جاہلیہ کے احیاء کو آپ نے فرمایا:۔

من تعزّی علیکم بعزاء الجاھلیۃ فاعضوہ بھن ابیہ ولا تکنوا

اگر تمہارے سامنے کوئی جاہلی عصبیت کا نام لے یا کہے کہ فلاں قبیلہ، فلاں قوم کی دہائی ہے، فلاں کی زبان کی دہائی ہے یا کسی قوم کی توہین کرے محض نسلی بنیاد پر یا قبائلی بنیاد پر یا ایسی کسی عصبیت پر تو آپ نے فرمایا کہ سخت سے سخت لفظ اس کے لئے بولو اور اشارے وکنائے سے بھی کام مت لو، یعنی جو سخت سے سخت لفظ تمہاری زبان میں ہے وہ لفظ تم اس کے لئے استعمال کرو، اس لئے کہ آپ نے دیکھا ہے کہ یہ وہ عصبیت ہے جو قوم کے دم میں ہزاروں برس کے علمی و ادبی اور تہذیبی ذخیرے پر اور خدا کے مخلص اور بے لوث بندوں کی کوششوں پر اور ان کا خون پسینہ ایک کر دینے پر پانی پھیر کر رکھ دیتی ہے۔ یہ عصبیت ایسی اندھی ہے جس سے بڑھ کر کوئی اندھا وجود دنیا میں پیدا نہیں ہوا، یہ کسی کی رعایت کرنے کے لئے تیار نہیں۔

میں آپ کو آگاہی دیتا ہوں اور اپنی بات پہنچانا چاہتا ہوں کہ اس ملک کے لئے سب سے زیادہ خطرناک چیز یہ لسانی یا تہذیبی عصبیت یا قدیم تہذیب کے احیاء کی دعوت ہے۔ میں تنہا پاکستان کی بات

نہیں کرتا اور بھی دوسرے ممالک ہیں مثلاً مصر میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ فرعونی تہذیب کو زندہ کیا جائے جیسا کہ چند سال پہلے یہ فتنہ کھڑا ہوا تھا، یا ایران میں سائرس کی عظمت اور اس کو ایران کا ہیرو بنانے کا فتنہ پیدا ہو جائے تو وہاں اسلام کی چولیں ہل جائیں گی۔ اس لئے اس وحدتِ اسلامی کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے، یہی وحدتِ اسلامی ہے جو امن پسند ہے اور تعمیری صلاحیت رکھنے والی ہے، وہ انسانوں کو جوڑتی ہے توڑتی نہیں اور انسانوں کے لئے تعمیر کا باعث ہے تخریب کا باعث نہیں۔ اللہ نے ہم کو آپ کو بہت پہلے یہ نعمت عطا کی تھی۔

واذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ کنتم اعداءً فالّف بین قلوبکم
فاصبحتم بنعمتہٖ اخواناً

خدا کے اس احسان کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، اللہ نے تمھارے دل ملا دیئے، تم اس کے فضل سے، اس کے احسان سے بھائی بھائی ہو گئے اور ایسے بھائی ہوئے کہ انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ جب سیرت کے واقعات پڑھتا ہے کہ مصعب بن عمیرؓ کے بھائی ابو عزیز کی مشکیں باندھی جا رہی ہیں، مصعب جب سامنے سے گزرتے ہیں تو کہتے ہیں ذرا اچھی طرح باندھنا موٹی اسامی ہے، اس کے فدیہ کی زیادہ رقم وصول ہوگی، وہ اپنے بھائی مصعب کی طرف دیکھتے اور کہتے ہیں کہ اے میرے بھائی تم سے تو امید یہ تھی کہ میری سفارش کرو گے اور تم الٹا اس شخص کو ہدایت دیتے ہو۔ تو انھوں نے کہا کہ تم میرے بھائی نہیں ہو، میرا بھائی یہ ہے جو تم کو باندھ رہا ہے، اس عقیدے کی وحدت نے اور مقصد کی وحدت نے اس طرح دلوں کو ملا دیا تھا، اس کے مقابلہ میں زبان کی وحدت کا حال معلوم ہے، آپ دیکھتے ہیں کہ ایک زبان بولنے والوں کے آپس کے تعلقات کا کیا حال ہے کیا ان کی زبان نے ملانے کا کوئی کام کیا تھا، کیا اس نے ان کو نفسانیت اور اپنے ذاتی اغراض سے بالاتر کر دیا ہے اور کیا اس نے اصلاحِ انسانیت کا جذبہ پیدا کیا ہے، کیا وہ دوسری

زبان۔ والوں کے مقابلے میں صف آرا ہونے سے فرصت پاتے ہیں تو آپس میں شیر وشکر ہو جاتے ہیں۔ کیا وہ ایک دوسرے کی عزت کو اس احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں جس سے اپنے مال کو، اپنی عزت وآبرو کو دیکھتے ہیں۔ اقبال نے کہا ہے ؏

یک دلی از یک زبانی بہتر است

ایک زبان ہونے سے کام نہیں چلتا، ایک دل ہونا چاہیئے اور زبان ایک دل نہیں کرتی صرف منفی رول ادا کرتی ہے، دوسروں کے مقابلہ میں زبان کی دہائی دے کر یا زبان کا حوالہ دے کر وہ ان طاقتوں کو مجتمع کرتی ہے جس سے ان کو مقابلہ کرنا ہے۔

آپ کو وحدتِ اسلامی کا منصب حاصل ہے

اللہ نے اس وحدتِ اسلامی کی نعمت ہی آپ کو عطا نہیں کی ہے، آپ کو اسکی دعوت دینے کی ذمہ داری بھی تفویض کی ہے، آپ کا فرض ہے کہ دنیا کے سامنے نمونہ پیش کریں کہ وحدتِ اسلامی کے ثمرات و برکات کیا ہوتے ہیں۔ اگر کسی کو وحدتِ اسلامی کو دیکھنا ہو تو وہ پاکستان کو دیکھے، یہاں کسی ایسی وحدت کی اجازت اور اس کے لئے آپ کو کسی قسم کی کوئی چھوٹ نہیں دینی چاہیئے جو آپ کو ایک دوسرے سے جدا کرے اور یہاں وہ مشکلات اور وہ مسائل پیدا کرے جن کا حل کسی بڑے سے بڑے سیاستداں اور کسی بڑے سے بڑے قائد کے پاس نہیں، یہ اللہ کی نعمت کی بڑی ناقدری ہوگی کہ جس بنیاد پر یہ ملک و معاشرہ قائم ہوا ہے، وہ بنیاد منہدم یا کمزور ہو جائے۔ یہاں مسلمان کس کشش پر آئے؟ کس نام پر آئے؟ کس شمع پر یہ سب پروانے جمع ہوئے؟ کیا وہ زبان تھی؟ کیا وہ تہذیب تھی؟ کیا وہ معاشرت و تمدن تھے، یہاں کی آبادی کے مختلف حصوں میں معاشرہ و تمدن کا ایسا فرق بھی ہو سکتا ہے جو دو قوموں میں ہوتا ہے۔ صوبہ سرحد کے رہنے والے اور یوپی کے رہنے والے ایک مسلمان

کے تمدن میں، لباس میں وہ فرق ہو سکتا ہے جو دو ملکوں کے باشندوں میں ہوتا ہے۔ یہ فرق موجود ہے اور اگر آپ اس موقر مجلس پر نظر ڈالیں تو یہ فرق آپ کو نظر آجائے گا، لیکن ان سارے امتیازات پر، ان سارے تنوعات پر جو چیز حاوی ہے وہ کیا ہے؟ وہ یہ وحدتِ ایمانی ہے۔ یہی وحدتِ ایمانی آپ کو مربوط بھی رکھے گی، مضبوط بھی، باعزت بھی رکھے گی، محفوظ بھی، آپ اس وحدت کی قدر کریں دنیا میں اسکے داعی اور علمبردار بنیں، یہ اپنی خدمت بھی ہوگی معاصر دنیا کی بھی جو تفریق و تقسیم کی زخم خوردہ ہے۔

آخر میں، میں آپ سب حضرات کی عزت افزائی اور محبت کا شکر گذار ہوں کہ آپ دور دور سے تشریف لائے اور دلچسپی اور توجہ سے میری معروضات سنیں۔ خاص طور پر حکیم محمد سعید صاحب کا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے میرے لئے ایسا زریں موقع اور ایک ایسی چیدہ مجلس یہاں بلائی جس کے سامنے مجھے اپنے خیالات کے اظہار کا موقع ملا۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

عالمِ اسلام کا عبوری دَور

یہ تقریر اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان کی طرف سے مقرر کے اعزاز میں ۱۸ر جولائی ۱۹۸۳ء کو اسلام آباد ہوٹل ہال میں دیئے گئے ایک استقبالیہ میں کی گئی۔ صدارت سپریم کورٹ پاکستان کے چیف جسٹس جناب انوار الحق صاحب نے کی، جلسہ میں سپریم کورٹ کے جج صاحبان، وفاقی وزراء، اسلامی نظریاتی کونسل کے ارکان، علماء اور جدید تعلیم یافتہ حلقہ کی نمائندہ شخصیتیں موجود تھیں۔

استقبالیہ کلمات اور افتتاحی تقریر جسٹس محمد افضل چیمہ صدر اسلامی نظریاتی کونسل کی ہوئی، اور صدارتی خطاب چیف جسٹس انوار الحق صاحب نے فرمایا:

بعد خطبہ مسنونہ

صدر محترم، حاضرینِ گرامی قدر! میرے لئے بڑے شکر و مسرت کا مقام ہے کہ جن حضرات کی خدمت میں مجھے فرداً فرداً جانا چاہیئے تھا اور مجھے ان سے اپنا دردِ دل یا اپنے مطالعہ اور فکر کا نتیجہ علیحدہ علیحدہ پیش کرنا چاہیئے تھا وہ یہاں خود تشریف لائے ہیں، اور مجھے ایک ایسا موقع ملا ہے کہ میں ان سب حضرات کی خدمت میں عرض کر سکتا ہوں، یہ بڑی خوشی کا موقع بھی ہے اور بڑی ذمہ داری کا بھی، میں یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں کہ مجھے اس پر زیادہ خوش ہونا چاہیئے یا ذمہ داری کے احساس سے مجھے متفکر اور گراں بار ہونا چاہیئے؟ بہرحال یہ دو ملے جلے احساسات ہیں اور میں نے بے تکلف ان کو آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔

یک لحظہ غافل گشتم وصد سالہ راہم دور شد

حضرات! ہم اس وقت عالم اسلام میں بڑے نازک مرحلے سے گزر رہے ہیں، یہ ایک عبوری مرحلہ ہے اور عبوری مرحلہ ہمیشہ بڑا نازک اور دشوار ہوتا ہے۔ اسلامی ملکوں کی قیادتیں اور اسلامی ملکوں کے دل و دماغ کوئی لمحہ ضائع کر دیں یا کسی انفرادی اور وقتی مسئلہ میں الجھ کر رہ جائیں تو زندگی کا رواں دواں قافلہ رعایت نہیں کرے گا۔ زمانہ کا سیلاب صرف سیلاب تھمتا ہے وہ کسی کشتی کے ڈوبنے کی پرواہ نہیں کرتا حالی نے کہا تھا اور میرا خیال ہے کہ انھوں نے اپنے محدود ماحول میں اور محدود تخیل میں کہا ہوگا ؎

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

سرزمین اندلس کا ایک عزیز پیام

ابھی جسٹس افضل چیمہ صاحب نے اسپین یعنی اندلس مرحوم کا ذکر کر کے داغ کہن تازہ کر دیئے اور میرے دل کو خاص طور سے تڑپا دیا کہ میں خوش قسمتی کہوں یا بد قسمتی کہ اس سرزمین رنگ و بو سے گزرا ہوں اور اس کی تاریخ بھی پڑھی ہے۔ آپ یقین مانئے میں ممالک اسلامیہ میں سے شاید ایک ہی دو ایسے ملکوں کے دیکھنے سے جو شاہراہ عام سے ہٹے ہوئے ہیں اس وقت تک محروم رہا ہوں ورنہ بیشتر اسلامی ممالک سے گزرا ہوں۔

لیکن میں جب اندلس گیا تو معلوم ہو رہا تھا کہ فضائیں مجھ سے لپٹ رہی ہیں اور یہاں کی روحیں مجھ سے معانقہ کر رہی ہیں، زمین کا ذرہ ذرہ کچھ پیغام رکھتا ہے اور مجھ سے کہنا چاہتا ہے، میں یہ سمجھا کہ وہ اسلامی ممالک کے مستقبل کے متعلق مجھے آگاہ کرنا چاہتا ہے، اندلس کا ذرہ ذرہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ دیکھو! عالم اسلام

کا کوئی دوسرا ملک اس المیہ سے دوچار نہ ہونے پائے۔ یہ بات تمہارے ذمہ امانت ہے، یہ اس سرزمین کے ہر ذرہ کا پیغام ہے، جہاں تک پہنچا اسکو اب اسلام کی تاریخ میں اور مسلمانوں کے صبر و تحمل میں اس کی بالکل گنجائش نہیں کہ کوئی دوسرا ملک اسپین بنے۔ میں یہ الفاظ زبان سے ادا کرتے ہوئے بھی تکلیف محسوس کرتا ہوں لیکن یہ ایک پیام ہے، میرا فرض ہے کہ میں اسکو ہر ملک میں دہراؤں۔

عالمِ اسلام ایک عبوری دور سے گزر رہا ہے

عالمِ اسلام اس وقت ایک عبوری مرحلہ سے گزر رہا ہے، پورا ڈھانچہ ٹوٹتا جارہا ہے اور ایک نیا ڈھانچہ بنایا جارہا ہے۔ یہ وقت ہوتا ہے جب قوموں کی قسمتیں بدل جاتی ہیں اور ایک نیا سلسلہ شروع ہوتا ہے، نئی تقدیر لکھی جاتی ہے، اس وقت پورا عالمِ اسلام ایک عبوری دور سے گزر رہا ہے، یہ دور جہاں ایمان و عقیدہ کی طاقت چاہتا ہے وہاں بڑے عمیق مطالعہ کا بھی طالب ہے، بڑی سنجیدگی اور فکر کی گہرائی کا بھی طالب ہے اور ایثار و قربانی کا بھی طالب ہے، یہ مرحلہ بغیر ان عناصر کے طے نہیں ہوتا اور نہ کبھی اس سے پہلے طے ہوا ہے اور نہ اس وقت طے ہوسکتا ہے، یہ جس طرح ہمارے عقیدہ کا امتحان ہے اسی طرح ہماری ذہانت کا بھی امتحان ہے، اس لئے کہ ایک معاشرے کا نیا ڈھانچہ بنانا، اس کو اسلام کی تعلیم کے مطابق کرنا، ان عناصر کو خارج کرنا جو اس کے منافی ہیں اور ایک نیا تمدن تشکیل میں لانا ہے کل میں نے عرض کیا تھا[1] کہ اس وقت اسلام ایک عقیدہ کی حیثیت سے موجود ہے، لیکن اس کو اس کے تمدن سے محروم کر دیا گیا ہے، اور یہ مغرب کی بہت بڑی سازش ہے کہ اس نے جب یہ دیکھا کہ مسلمانوں کو عقیدہ سے ہٹانا مشکل ہے اور ان کے احساسات اس کے بارے میں بہت تیز ہیں، اس کو اس کے بہت تلخ تجربے ہوئے ہیں۔ جنگِ صلیبی سے لیکر اسپین کی نسل کشی اور مسلمانوں کے کلی اخراج سے لے کر اس وقت تک تو

---

[1] اس استقبالیہ میں جو مقرر کے اعزاز میں اسلام آباد ہوٹل کی طرف سے دیا گیا

اس نے اپنے ان تجربوں سے فائدہ اٹھایا اور اس نے یہ حکمت عملی (STRATEGY) طے کی کہ مسلمانوں کو ان کے عقیدہ سے ہٹانے کے بجائے ان کے تمدن سے اور ان کے نظام معاشرت سے علیحدہ اور محروم اور اس پر آمادہ کر دینا چاہیئے کہ وہ دوسرا تمدن اختیار کر لیں اور اس میں میں سمجھتا ہوں یورپ بڑی حد تک کامیاب ہوگیا ہے۔ خدا کے فضل سے اسلامی عقائد کے بارے میں کوئی تحریف واقع نہیں ہوئی ہے جیسا کہ عیسائیت میں واقع ہوئی تھی، عیسائیت جس طرح حضرت مسیح کی دی ہوئی پٹری سے ہٹ کر سینٹ پال کی پٹری پر پڑ گئی اور وہ برابر اس پر چل رہی ہے مسیحیت صراطِ مستقیم سے ہٹ کر تثلیث، ابنیتِ مسیح کے عقیدے اور رومی تمدن کی پٹری پر پڑ گئی اور پھر اس پر برابر چلتی رہی، پھر ایسے واقعات پیش آئے کہ وہ رفتار تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی، کاش کہ یہی ہوتا کہ اس کا مشرق کے سست کار اور ایک سوتے ہوئے قافلہ سے واسطہ پڑا ہوتا لیکن وہ مغرب تھا اور مغرب میں وہ طاقتیں ابل رہی تھیں، ترقی کے جذبات موجزن تھے، زندگی کا گرم خون رگوں میں دوڑ رہا تھا اور ساری دنیا میں وہ خون جاری اور ساری ہونا چاہتا تھا۔ جہاں اور چیزوں کی رفتار تیز سے تیز تر ہوئی وہاں اس انحراف و ضلالت کی رفتار بھی تیز ہو گئی، اس لئے کہ جن قوموں کے ساتھ اس کی قسمت وابستہ تھی یا جو قومیں اس کی حامل تھیں وہ سست رفتاری پر قانع نہیں تھیں، ان کو یورپ کے خاص حالات کی بنا پر "تنازع للبقاء" کے اصول پر عمل کرنا تھا اور زندگی کے سخت مقابلہ میں ان کو اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرنا تھا اس لئے ہر چیز کی رفتار تیز ہو گئی۔ عیسائیت کے صراط مستقیم سے انحراف کی رفتار بھی تیز ہوتی چلی گئی۔

ایسی کوئی تحریف یا انحراف الحمدللہ عالمِ اسلام میں پیش نہیں آیا۔ اور قرآن مجید کی زبان میں:۔
انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون" کے عقائد اور اصولِ دین کی حد تک ایسا انحراف پیش آ بھی نہیں سکتا، خدا نے اس دین کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے، لیکن جہاں تک تمدن اور زندگی کا تعلق ہے، ظاہر ہے کہ کوئی عقیدہ، کوئی تعلیم یا اس کی حامل کوئی قوم خلا میں نہیں رہ سکتی، اسکو ایک ماحول چاہیئے

اس کو آزادی چاہیئے، اس کو وسائل چاہیئیں، اپنے معاشرہ کی تشکیل کی آسانی چاہیئے۔ عقائد میں انحراف اور تبدیلی نہیں ہوئی، لیکن عقائد کے نتیجے میں جو اخلاق اور جو زندگی کا طرزِ عمل متعین ہوتا ہے، اس طرزِ عمل کو عملی طور پر ظاہر ہونے کے لئے ایک آزاد ماحول چاہیئے، ایک معاشرہ چاہیئے اور ایک ایسا خطہ چاہیئے ..... جہاں وہ آزادی کے ساتھ سانس لے سکے اور اپنے اصول پر عمل کر سکے تو اس بارے میں یورپ کو کامیابی حاصل ہوئی کہ اس نے اسلام کو، مسلمانوں کو اصل اسلامی تمدن سے دور کر دیا اور اپنا تمدن ان پر مسلط کر دیا، یا اس کو ان کے لئے دلفریب بنا دیا۔

اسلام کو اقتدار کی ضرورت ہے

اگرچہ میرا تعلق فطری طور پر، خاندانی طور پر اور علمی طور پر اس مکتبِ فکر اور اس گروہ سے ہے جو خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات پر وسعت افلاک میں تکبیرِ مسلسل کو ہمیشہ ترجیح دیتا رہا، میری مراد سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اولوالعزم، عالی ہمت رفقاء سے ہے جنھوں نے احیائے خلافتِ اسلامیہ کی کوشش کی اور ان پچھلی صدیوں میں پورے عالم اسلام میں کسی ایسی جامع، مکمل، بلند نظر، بلند ہمت جماعت کا سراغ نہیں لگتا جیسی کی حضرت سید صاحب کی جماعت تھی، میرا تعلق اس جماعت سے ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اسلام کو اقتدار کی ضرورت ہے، مسلمانوں کو حریت کی فضا کی ضرورت ہے اور خدا کا یہ فرمان جس طرح نزول کے وقت صحیح تھا آج بھی صحیح ہے اور قیامت تک صحیح ہوگا:

الذین ان مکنٰھم فی الارض	یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس
اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا	دیں تو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک
بالمعروف ونھوا عن المنکر	کام کرنے کا حکم دیں اور برے کاموں سے
(الحج)	منع کریں

آپ خیال کیجیے کہ معروف و منکر کے لئے قرآن مجید میں اور حدیث میں امر و نہی کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، استدعا اور درخواست کے الفاظ استعمال نہیں کئے گئے ہیں، عربی زبان ایسی تنگ دامن نہیں ہے کہ اس کے اندر صرف امر و نہی کے الفاظ ہوں اور دوسرے الفاظ نہ ہوں جن میں تواضع ہے، خوشامد ہے جن میں استدعا ہے جن میں مطالبہ ہے، بلکہ اسکے لئے جہاں کہیں بھی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ امر اور نہی کے ہیں۔ تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر كنتم خير أمة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر۔ اور امر و نہی طاقت چاہتے ہیں۔ امر و نہی وہ مقام چاہتے ہیں جہاں سے ہم اعتماد کے ساتھ اور جرأت کے ساتھ یہ کہہ سکیں کہ یہ صحیح ہے اور یہ غلط ہے۔ امر میں اور نہی میں ایک استعلاء ہے۔ امر و نہی درخواست کے معنی میں نہیں، امر و نہی حکم دینا اور روکنا، اس کے لئے آدمی کے اندر قوت چاہیے، ایسا مقام اور ایسی بلندی چاہیے، ایسا اعتماد چاہیے اور اس کی ایسی وقعت ہو دلوں میں کہ وہ امر کر سکے اور نہی کر سکے، اسکا مطلب یہ ہے کہ اسلام کو قوت کی ضرورت ہے، اسلام کو اقتدار کی ضرورت ہے کہ ہمیشہ وہ یہی نہ کہے کہ "اگر ایسا کر لیا جاتا تو اچھا تھا۔" "ہماری درخواست ہے اور ہم آپ کو ترغیب دیتے ہیں" "ہم تبلیغ کرتے ہیں"۔ اپنی جگہ پر یہ سلسلہ جاری رہے گا لیکن قرآن جو معیار و میزان ہے اس میں الفاظ امر و نہی کے ہیں جن میں مسلمانوں کو وہ طاقت حاصل کرنی چاہیے کہ جس مقام پر فائز ہو کر وہ حکم دے سکیں اور روک سکیں، اس لئے کہ فطرتِ انسانی تعریف تو کر دیتی ہے اور وہ خوش بھی ہو جاتی ہے لیکن انسانی نسل کی پوری اصلاح، مکمل اصلاح اس کے بغیر نہیں ہو سکتی جس کے نتیجے میں اقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ اور امروا بالمعروف اور نہوا عن المنکر کے الفاظ آئے ہیں۔

سارا انحصار شاخ پر ہے

اگرچہ میرا اس فکر و تحریک سے تعلق ہے، لیکن میں آپ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ جس شاخ پر نشیمن ہم کو

بنانا ہے اس شاخ کی فکر کی ضرورت ہے۔ ہمارا سارا انحصار اس شاخ پر ہے۔ شاخ اگر قائم ہے، ہری بھری ہے استوار و پائدار ہے تو اس کے بعد یہ مسئلہ آتا ہے کہ نشیمن کیسا ہو؟ نشیمن بلبل کا ہو یا زاغ و زغن کا؟ لیکن پہلے تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ شاخ ہے بھی یا نہیں۔ اگر شاخ نہیں ہے تو پھر کوئی سوال نہیں اٹھتا کہ نشیمن کیسا ہو؟

وہ شاخ جس پر نشیمن ہو گا وہ شاخ ہے معاشرہ وہ شاخ ہے کسی ملک کی عام زندگی، شہر میں چلنے والے بازار میں خرید و فروخت کرتے والے، کارخانوں میں کام کرنے والے، اور مدرسوں میں، دانشگاہوں میں پڑھنے اور پڑھانے والے انسان، یہ عام انسان جن سے زندگی عبارت ہے، جن سے شہروں کی رونق ہے، یہ اصل آبادی ہے بیکیا ہے، اس کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے پیمانے کیا ہیں، اس کے احساسات کیا ہیں؟ اس میں نشیمن کو اٹھانے نشیمن کو برداشت کرنے کی کتنی صلاحیت ہے؟ آپ نشیمن زمین پر عافیت کی جگہ پر بہتر سے بہتر بنائیں، لیکن کسی شاخ پر اس کو آپ قائم کرنا چاہتے ہیں، وہ شاخ اگر اس کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی، اور زبانِ قال سے نہیں لیکن زبانِ حال سے اس کی پتی پتی، اس کا ایک ایک ریشہ یہ اعلان کرتا ہے کہ ہم اس کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے اور ہم کو نشیمن نہیں چاہیئے، تو یہ ساری محنت بیکار جائے گی۔ مسئلہ یہ ہے کہ شاخ بھی نشیمن چاہتی ہے یا نہیں؟ پھر نشیمن کا بوجھ شاخ برداشت کر سکتی ہے یا نہیں، سارا انحصار اس پر ہے کہ ہمارا معاشرہ کیسا ہے؟ ہمارا معاشرہ اعتقادی طور پر اور اخلاقی طور پر کیسا ہے؟ زندگی کی بنیادی چیزیں، اولین اصول، انسانیت کی ابتدائی شرائط کو پورا کر رہا ہے یا نہیں؟

معاشرہ ایسا ہے کہ گناہ کی رغبت، نفس پرستی، بوالہوسی اس کا مزاج بن گئی ہے جس طرح کہ مچھلی اگر پانی سے نکال کر خشکی میں ڈال دی جائے تو اس کا دم گھٹنے لگتا ہے، یہ معاشرہ ایسا ہے کہ اگر اس میں صلاح کی دعوت دی جائے، اگر خدا کے خوف کی دعوت دی جائے یا اچھے اخلاق کی دعوت دی جائے، فسق و فجور سے بچنے کی دعوت دی جائے تو اس معاشرہ کا دم گھٹنے لگتا ہے جیسے مچھلی کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ میں قرآن مجید کی اس آیت پر غور کرتا ہوں تو اس کے اعجاز و صداقت کے سامنے انگشت بدنداں رہ جاتا ہوں۔ ایک فاسد مسخ شدہ

معاشرے نے کس خوبی سے اپنے احساسات اور اپنے مضمرات کی ترجمانی کی ہے۔

اخرجوا آل لوطٍ من قریتکم انھم اناس یتطھرون

یعنی معاشرہ چیخ اٹھا، اس معاشرہ نے پکار کر کہا اور بغیر کسی پردہ اور شرم وحجاب کے کہا کہ ان پاکبازوں کی گزر ہم لوگوں کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ اخرجوا آل لوطٍ من قریتکم انھم اناس یتطھرون۔ ہم تو نجاست میں گلے گلے ڈوبے ہوئے ہیں، ہم وہ مچھلی ہیں جو نجاست میں زندہ رہ سکتی ہے، یہ جو ایک رو آئی ہے طہارت کی یہ ہمیں برداشت نہیں، ہم اس کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتے، ہم رہیں گے یا یہ، اگر آپ کو رہنا ہے تو ہم چلے جائینگے یہ بستی چھوڑ کر۔

جب معاشرہ کی یہ کیفیت ہو جائے گی اس معاشرہ کی صورت حال کو اور اصل زندگی کو نظر انداز کر کے کاغذ کے صفحات پر یا کسی گوشہ میں بیٹھ کر کوئی نقشہ کوئی نظام بنایا جائے گا تو وہ نظام کامیاب نہیں ہو سکتا، اس لئے یہ نشیمن بہرحال اس پر قائم ہو گا۔ آپ کو اگر اس نشیمن کو قائم کرنا ہے تو اس کی فکر کیجئے کہ وہ شاخ کس حالت میں ہے اگر اس شاخ پر تیشہ چلانے والے سینکڑوں ہیں اور نشیمن بنانے والا ایک ہے اور میں مانتا ہوں کہ وہ اعلیٰ درجہ کی صلاحیت اور پورے وسائل رکھتا ہے لیکن جہاں ہزار آدمی تیشہ چلا رہے ہوں تو وہ ایک آدمی جو نشیمن بنا رہا ہے یا کوئی تعمیری کام کرنا چاہتا ہے، وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کوئی عمارت اس طرح کھڑی نہیں ہو سکتی کہ اس پر مسلسل تیشے چل رہے ہوں اور کچھ لوگ اس کو بنا بھی رہے ہوں۔ وہ عمارت کبھی بنکر تیار نہیں ہو سکتی۔

معاشرہ زمین ہے

معاشرہ زمین ہے، اگر یہ زمین درست ہے، اپنی جگہ پر قائم ہے، قرآن کے الفاظ میں کثیباً مھیلاً ریت کا ٹیلہ نہیں ہے جو ہر وقت کھسکتا رہتا ہے، جب ہوا آتی ہے تو اس کے ذرات کو اڑا کر لے جاتی ہے، اس کا کسی وقت بھی اطمینان نہیں کہ کل جب آندھی کا طوفان آئے گا تو یہ ٹیلہ نہیں رہے گا۔ اگر ہماری

سوسائٹی ریگ رواں کی طرح ہے، جب کوئی چالاک آدمی اس سوسائٹی میں پیدا ہو جائے تو پوری سوسائٹی کو اپنا مسحور بنا سکتا ہے۔ اس کے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ یہ سوسائٹی مل جاتی ہے، اگر سوسائٹی میں اتنی بھی مقاومت، خطرہ کے مقابلہ کی طاقت نہیں ہے، اگر اس میں تنکے کی طرح بہتے ہوئے پانی میں بہہ جانے کی صلاحیت ہے اور وہ ہر وقت اس کے لئے تیار رہتی ہے کہ کوئی مفسد طاقت یا دعوت، یا نظام یا فلسفہ آجائے تو اس کی ہمنوائی کرنے لگے اور اس کی ساری محنتوں پر پانی پھیر دے، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اس معاشرہ کا اس سوسائٹی کا خدا ہی حافظ ہے اور اس کا کوئی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

واقعہ یہ ہے کہ کہیں کا بھی اسلامی معاشرہ ایسا نہیں ہے کہ آپ اس پر پورے طور پر اعتبار کر سکیں، ابھی کل کی بات ہے۔ مجھے معاف کیا جائے اور بعض لوگ میرے ان خیالات سے متفق نہ ہوں کہ جمال عبدالناصر کا زمانہ تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مصر میں ایک شخص، ایک متنفس بھی ایسا نہیں ہے جس کو جمال عبدالناصر سے اختلاف ہے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی آواز پر تالی بجانے، اس کے پیچھے چلنے اور اس کی کار کے پیچھے نعرے لگانے کے لئے پورا مصر مست ہے، اس کو تقدس و عصمت اور محبوبیت و مقبولیت کا اعلیٰ مقام عطا کیا گیا اور بالکل پیغمبروں کی صف میں بٹھا دیا گیا۔ اس کے بعد یہ طلسم ٹوٹا تو معلوم ہو گیا کہ کچھ بھی نہیں تھا۔ آج کوئی سیدھے منہ سے اس کا نام لینے کے لئے تیار نہیں۔ اس کے بعد اور بھی بہت سے معاشرے ہیں جن میں اگر کوئی شخص جو ذرا بھی اثر ڈال سکتا ہو، عوام پر یا خواص پر، اگر وہ کھڑا ہو جائے تو پورا کا پورا معاشرہ اس کے قدموں میں پڑ جاتا ہے کہ چاہے وہ اس کو پامال کرے، چاہے زندہ کرے ؎

زندہ کنی عطائے تو ۔۔۔۔ ور بکشی لقائے تو

یہ بڑی خطرناک صورت حال ہے۔

اسلامی شریعت کے نفاذ میں ایک لمحہ کی بھی تاخیر نہ ہو

اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلامی قانون سازی کی جو بات کی جا رہی ہے، اسلامی شریعت کے نفاذ کے

. .. . جو مبارک ارادے ہیں ان میں سستی پیدا کی جائے۔ میں ہرگز اس غلط فہمی کی اجازت نہیں دوں گا، ایک لمحہ کے لئے بھی اس کوشش کو رد کرنے کے حق میں نہیں، لیکن اس حقیقت کو آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں کہ کامیابی کا انحصار اسی معاشرہ پر ہے، اگر معاشرہ اس کا استقبال کرتا ہے اور ہم نے ہمارے دین کے داعیو مصنفین نے، صحافت نے ہمارے ٹیلی ویژن (TELIVISION) نے ریڈیو نے میں یہاں تک عرض کرتا ہوں کہ ابلاغ کے جتنے ذرائع ہیں اگر ان سب نے یہ کوشش کی، یہ مہم چلائی کہ پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے پیمانے بدلیں اندر کے احساسات بدلیں اور نیکی، خدا ترسی، سنجیدگی، متانت، صبر و تحمل، نفس کی ترغیبات، مالی ترغیبات یا اخلاقی امتحانات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے تو پھر اس معاشرہ پر بڑے سے بڑا بوجھ ڈالا جا سکتا ہے اور وہ خلافتِ اسلامی کا بھی بوجھ برداشت کر سکتا ہے اور مجھے اس میں بالکل شبہ نہیں... کہ اگر معاشرہ کی اصلاح ہو جائے اور یہ ساری طاقتیں جو اثر انداز ہوتی ہیں ان میں آپس میں تعاون ہو اور یہ سب اشتراک عمل کے ساتھ معاشرے کی اصلاح میں کچھ عرصہ لگ جائیں تو خلافتِ اسلامیہ کا خواب بھی حقیقت بن سکتا ہے، اس وقت صورت یہ ہے کہ اس گروہ کا جادو چل رہا ہے اور اس کے ہاتھ میں ابلاغ کے ذرائع ہیں جن کی تعریف قرآن نے ان الفاظ میں کی ہے:-

ان الذین یحبون ان تشیع الفاحشۃ	جو لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ مومنوں میں
فی الذین امنوا لھم عذابٌ	بے حیائی پھیلے ان کو دنیا اور آخرت میں دکھ
الیم فی الدنیا والاٰخرۃ واللہ	دینے والا عذاب ہوگا۔ اور خدا جانتا ہے اور
یعلم وانتم لا تعلمونْ (سورۃ النور)	تم نہیں جانتے۔

یہ آیت ایک معجزہ ہے، جس وقت یہ آیت ان الذین یحبون ان تشیع الفاحشۃ فی الذین امنوا نازل ہوئی تھی، مدینہ طیبہ کے محدود معاشرے میں ایک خاص واقعہ پیش آیا تھا۔ اس واقعہ کا لوگ اپنی مجلسو میں چرچا کرنے لگے۔ مجلسیں کتنی بڑی تھیں، وہ واقعہ کتنا بڑا تھا، کن افراد سے اس کا تعلق تھا، یہ ساری چیزیں

ایسی تھیں کہ قرآن مجید کی...... اس آیت کی وسعت اس سے زیادہ تھی، وہ قرنوں سے بڑھ کر اور تاریخی اور جغرافیائی فاصلوں سے آگے بڑھ کر کچھ اور چاہتی تھی۔ آج ہم اس آیت کی تفسیر دیکھ رہے ہیں۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اہل ایمان میں فواحش اور منکرات کی محبت کا رواج ہو اس کا تصور آج صحافت، ٹیلی ویژن، ریڈیو کے اس دور میں، ناولوں کے اس دور میں، پکچر اور فلم کی ترقی کے اس دور میں اور لٹریچر اور فلسفوں کے اس دور میں اس کی جیسی تفسیر تفسیر نہیں، بلکہ تصویر دیکھی جا سکتی ہے، کسی اور زمانہ میں مشکل ہے۔ مدینہ کے اس ماحول میں لوگوں نے ایمان بالغیب سے کام لیا ہوگا اور انھوں نے اس کا انطباق کیا ہوگا کسی مخصوص واقعہ پر، لیکن آج دنیا کی ساری طاقتیں جس طرح ان تشیع الفاحشة پر لگی ہوئی ہیں اس کا اس سے پہلے کیا اندازہ ہو سکتا تھا۔

کچھوا سست رفتاری کے باوجود سو رہا ہے اور خرگوش تیزی کے ساتھ مصروف عمل ہے۔

ہم نے اور آپ نے بچپن میں یہ کہانی سنی تھی کہ خرگوش اور کچھوے میں مقابلہ ہوا، خرگوش بہت تیز رفتار، کچھوا بہت سست رفتار، لیکن کچھوا محنتی تھا، وہ مسلسل چلتا رہا اور خرگوش سو گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ روایتی کچھوا اس روایتی خرگوش سے آگے بڑھ گیا، آج معاملہ اس کے برعکس ہے، آج مقابلہ کچھوے اور خرگوش کا ہے لیکن معاملہ یہ ہے کہ کچھوا اپنی سست رفتاری کے ساتھ بھی سو رہا ہے اور خرگوش اپنی معروف تیز رفتاری کے ساتھ سرگرم عمل ہے۔ آج ہماری اور تخریبی طاقتوں کی مثال یہی ہے، عالم اسلام کی تعمیری کوششیں اس کچھوے کی طرح ہیں جو سست رفتار بھی ہے اور جاگ بھی رہا ہے، آپ تخریبی اور تعمیری طاقتوں کا مقابلہ کر کے دیکھیں، ہر جگہ یہ کچھوے اور خرگوش کی کہانی آپ کو بالکل واقعہ نظر آئے گی۔

ہمارے معاشرہ میں تخریبی طاقتیں جس طرح اخلاقی انارکی اور بغاوت پھیلا رہی ہیں ان کے پاس وہ وسائل ہیں جو رات کو دن اور دن کو رات ثابت کر سکتے ہیں، نور کو ظلمت اور ظلمت کو نور بنا سکتے ہیں۔ ادھر ان

......تعمیری کوششوں کا، ان تعمیری اداروں کا حال یہ ہے کہ وہ وسائل سے بھی محروم ہیں، ان کے پاس قوتِ تنفیذ بھی نہیں ہے اور کشش CHARM اور لبھانے والی طاقتیں بھی نہیں ہیں۔

اس وقت اسلامی معاشرہ کا مسئلہ بہت اہم ہوگیا ہے اور یہ خام خیالی جو لوگوں کے ذہنوں میں بیٹھ گئی ہے کہ افراد کا معاملہ اتنا اہم نہیں ہے، اصل معاملہ ہے مجموعہ کا اور اجتماعیت کا، یہ دور ہے اجتماعیت کی تقدیس کا، اجتماعیت کا اتنا پروپیگنڈا کیا گیا ہے، فلسفۂ سیاست، اجتماعیات اور عمرانیات کے ذریعہ جو ایک مستقل فن بن گیا ہے، افراد کی اہمیت نگاہوں سے بالکل اوجھل ہوگئی ہے بلکہ ان کی نفی ہونے لگی ہے، لوگوں کے ذہن میں یہ بات ہے کہ افراد اپنی جگہ پر کیسے ہی ناقص اور فاسد ہوں، لیکن جب افراد ایک دوسرے سے مل جائیں گے ان کے ملنے سے، ان کے اجتماع سے جو مجموعہ وجود میں آئے گا، وہ صالح ہوگا، یعنی تختے چاہے کتنے ہی خراب ہوں، گھن کھائے ہوئے ہوں، کرم خوردہ ہوں، لیکن جب کشتی بنائی جائے گی، جہاز بنایا جائے گا تو وہ جہاز اچانک ایک بڑے بیڑے میں تبدیل ہوجائے گا، اور ان تختوں کی علیحدہ علیحدہ جو خرابی ہے وہ اس میں گم ہوجائے گی، اس کی ایک مثال یہ دی جاسکتی ہے کہ رہزن جب تک علیحدہ علیحدہ ہوں وہ رہزن ہیں لیکن اگر رہزن یونین بنالیں تو وہ پاسبان بن جاتے ہیں، چور اگر اپنا کوئی اتحاد قائم کرلیں، وفاق قائم کرلیں تو وہ چوکیدار کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں لیکن اگر الگ الگ ہیں تو چور ہیں، رہزن ہیں، یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آئی کہ ایک رہزن رہزن ہے، دو رہزن، رہزن ہیں لیکن سو رہزن آپس میں مل کر پاسبان کیسے بن جاتے ہیں۔ یہی رہزنی جب ایک فردِ واحد میں ہے تو مضر ہے، لیکن ترقی کرکے سو کے درجے تک پہنچ تو اب کیسے مضر نہیں رہے گی، اگر وہ ایک نمبر کی مضر تھی تو اب سو نمبر کی مضر ہونی چاہیے۔ دنیا کی سیاسی، اقتصادی، اجتماعی تنظیمات سب کا حال یہی ہے یورپ، امریکہ اور روس کی حکومتوں کو دیکھیے، اسی کے ساتھ مشرقی حکومتوں کو بھی دیکھیے کہ وہ فاسق الخیال فاسد المقصد، جن کے مقاصد تخریبی، جن کی زندگی فاسد، جن کے اخلاق خراب، جن کے افکار وخیالات فاسد، ان سبھوں نے ایک اجتماعی نظام بنالیا ہے اور وہ اجتماعی نظام قوموں کی قسمتوں کا فیصلہ

کر رہا ہے۔

اسلام کے ترکش کا قیمتی تیر

یہاں پر اس وقت خدا نے ایک موقع میسر فرمایا ہے اور یہاں لوگوں کے ذہن میں خدا کی طرف سے یہ بات آئی ہے کہ اس ملک میں معاشرہ کی ایک نئی تشکیل ہونی چاہیئے اور اس ملک میں شریعت کا نفاذ ہونا چاہیئے اور بالاتری اور اقتدار اعلیٰ شریعتِ اسلامی کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے۔ یہ بہت مبارک بات ہے، محض اللہ کا فضل ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ محض اتفاقی واقعہ نہیں ہے۔ میں اتفاق کی منطق کا قائل نہیں، جو کچھ ہوتا ہے تقدیر الٰہی اور قضا و قدر کے فیصلہ پر ہوتا ہے، یہ ملک جس بلند مقام اور بلند نسبت پر قائم ہوا تھا اللہ تعالیٰ نے اسی نسبت کا لحاظ فرمایا اور اس کی عنایت و رحمت کی نظر ہوئی، اس لئے میں اس موقع کو غنیمت بلکہ نعمت سمجھتا ہوں اور اس سے فائدہ اٹھانے کی تلقین کرتا ہوں۔ میں آپ حضرات کو یہ بھی آگاہی دینا چاہتا ہوں کہ جب تک ترکش کا کوئی تیر آزمایا نہ جائے اس تیر کے متعلق اس قسم کا حسنِ ظن قائم کیا جا سکتا ہے، اس سے ڈرایا بھی جا سکتا ہے اور اس سے امید بھی قائم کی جا سکتی ہے، لیکن جب کوئی تیر ترکش سے باہر آجائے، وہ استعمال ہو جائے پھر اس کے بعد صرف حقیقت رہ جاتی ہے تجربہ رہ جاتا ہے اور کچھ نہیں رہ جاتا۔ اسلام کے ترکش کا یہ تیر بڑا قیمتی ہے، میں شریعت کا نفاذ اسے نہیں سمجھتا کہ چند حدود جاری ہو جائیں، شریعت کا نفاذ بہت وسیع لفظ ہے اور اس کا بڑا وسیع مفہوم ہے اس لئے میں کسی ملک کے متعلق شہادت دینے کے لئے تیار نہیں ہوں جب کہ اس کے پورے حالات مقاصد کا اور نیتوں کا علم نہ ہو جائے، لیکن بہر حال دنیا میں ایک چیز ایسی تھی جس کے متعلق کہا جا سکتا تھا کہ اگر وہ تیر ترکش سے نکلا تو پھر دنیا میں خیر و برکت کا دروازہ کھل جائے گا، جب تک وہ تیر ترکش سے باہر نہیں آیا تھا، اس کے آنے کی امیدیں پیدا نہیں ہوئی تھیں، اس وقت تک دنیا کی زبانیں

خاموش، قلم بھی خاموش، ہمارے لئے عذر کے مواقع بھی بہت تھے کہ کیا کیا جائے، شریعت کا نفاذ ہی پوری طرح نہیں ہو رہا ہے، اسلامی معاشرہ ہی درست نہیں ہو رہا ہے، اس سے کیسے اچھی امید کیجا سکتی ہے؟ لیکن جب وہ تیر باہر آجائے، پھر اس کے بعد کیا عذر ہو سکتا ہے، یہ تیر ایک ہی بار استعمال ہوتا ہے۔ یہ میں آپ سے عرض کر دوں کہ تاریخ کے تجربہ، تاریخ کے مطالعہ کی روشنی میں کہ یہ تیر بار بار استعمال نہیں ہوا کرتا، یہ ایسا تیر نہیں جو بار بار آزمایا جائے، پھر جا کر اٹھا لائیں، پھر ترکش میں رکھ لیں کہ ہم بوقت ضرورت استعمال کرتے رہیں گے، یہ تیر ایک مرتبہ کمان سے نکلا پھر واپس نہیں آیا، یہ بہت ہی نازک وقت ہے، میں ایک ایسے منتخب مجمع کے سامنے جس میں اس ملک کے چیف جسٹس موجود ہیں اور متعدد مرکزی وزراء موجود ہیں، علماء کرام بھی موجود ہیں، میں آپ سے پوری معذرت کے ساتھ یہ عرض کر رہا ہوں کہ صرف پاکستان کی تاریخ میں نہیں بلکہ تاریخ اسلامی میں ایک نازک مرحلہ آگیا ہے، ایسے مواقع پر آدمی اپنی سانس روک لیتا ہے۔

تجربے کامیاب بھی ہوتے ہیں، ناکام بھی ہوتے ہیں۔ ہماری انسانی زندگی ساری کامیاب اور ناکام تجربوں کا مجموعہ ہے، انسان ٹھوکر کھاتا ہے، پھر سنبھلتا ہے، گرتا ہے، پھر اٹھتا ہے۔ قوموں کی کشتیاں بھی ڈوبیں اور نکلیں اور یہ خدا کا قانون ہے "یولج اللیل فی النہار و یولج النہار فی اللیل و یخرج الحی من المیت و یخرج المیت من الحی" اور "قل اللّٰھم مالک الملک" میں جو حقیقت بیان کی گئی ہے "یقلب اللہ اللیل والنہار" یہ الٹ پھیر ہوتے رہتے ہیں، کسی تجربہ کا ناکام ہونا اتنا مضر نہیں ہے جتنا آئندہ تجربوں کے دروازوں کا بند ہونا مضر ہے۔

میں آپ سے کہتا ہوں جو مبارک کام آپ کرنے جا رہے ہیں، اس ملک و معاشرہ کے اندر اتنی صلاحیت ہونی چاہیئے کہ وہ اسکو قبول کرے، استقبال کرے اور پھر اسکو برداشت کر سکے ہضم کر سکے، اگر آپ کسی کمزور معدہ

میں کوئی لطیف ترین غذا بھی ڈال دیں اور وہ معدہ اس کو واپس کر دے، اسکو قبول نہ کرے تو اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا، اصلاح معاشرہ کا کام بڑے وسیع پیمانے پر شروع ہونا چاہیئے۔ مسجدوں کے منبروں سے، درسگاہوں سے، اخبار کے کالموں سے، ٹیلیوژن اور ریڈیو سے اور سیاسی مقررین کی تقریروں میں بھی اس کو نظرانداز نہیں ہونا چاہیئے قدم قدم پر اگر رشوت ہے، قدم قدم پر مالی ترغیبات ہیں، قدم قدم پر سنگدلی ہے اور اپنے ساتھیوں اور ایک محلہ کے رہنے والوں، شہر کے بسنے والوں سے اگر بے حسی ہے، ان کی مدد کرنے کا کوئی جذبہ نہیں ہے، ہمارے کارکنوں میں، دفتر کے کارکنوں میں اور ہمارے مختلف عہدوں اور محاذوں پر کام کرنے والوں میں تو پھر بہت بڑا خطرہ ہے۔

اسپین سے مسلمانوں کے اخراج کے اسباب

اسپین سے مسلمانوں کے اخراج کا سب سے بڑا سبب معلوم ہوا کہ جہاں ان میں اور بہت سی غلطیاں ہوئیں وہیں ان میں اشاعتِ اسلام کی کوشش نہیں کی، وہ شمال کی طرف نہیں بڑھے بلکہ جنوب کی طرف ہٹتے چلے گئے، انھوں نے وہاں کی عیسائی آبادی کو اپنے سے مانوس نہیں کیا، اسلام کا پیغام نہیں پہنچایا، وہ قلبِ یورپ میں نہیں گھسے اور اپنے ماحول کو درست نہیں کیا، وہ فنِ تعمیر اور اپنے تہذیبی اثاثہ کو وسیع کرنے میں مشغول ہوگئے فنونِ لطیفہ اور شاعری اور موسیقی کی طرف ان کی بہت زیادہ توجہ منعطف ہوگئی، لیکن سب سے بڑی بدقسمتی کی بات ان کا داخلی انتشار تھا، وہ ربیعہ و مضر اور یمانی و حجازی قبائل کا اختلاف تھا۔

لسانی عصبیت، صوبائی عصبیت، نسلی عصبیت اور تہذیبی عصبیت سخت خطرناک بیماریاں ہیں، قرآن مجید میں ہمیں یہ ہدایت کی گئی ہے:

لا یسخر قوم من قوم عسیٰ	کوئی قوم کسی قوم سے تمسخر نہ کرے،
ان یکونوا خیرا منھم ولا نساء	ممکن ہے کہ وہ لوگ ان سے بہتر
من نساء عسیٰ ان یکن خیرا	ہوں، اور نہ عورتیں عورتوں سے، ممکن

منھن، ولا تلمزوا انفسکم — ہے کہ وہ ان سے اچھی ہوں اور اپنے کو عیب
ولا تنابزوا بالالقاب (الحجرات) — نہ لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو۔

یہ مشورہ افراد ہی کے لئے نہیں ہے، یہ ملتوں کے لئے بھی مشورہ ہے، یہ وہ چیزیں ہیں جنھوں نے قوموں اور ملکوں کے چراغ گل کر دیئے ہیں۔ میں نے اپنے دوستوں سے جو ہندوستان سے پاکستان آنے والے تھے یہی کہا کہ آپ جا رہے ہیں تو اپنے اپنے دلوں سے یہ احساس برتری نکال دیجئے کہ آپ اہل زبان ہیں، آپ کی اپنی تہذیب ہے، اگر آپ خلافِ تہذیب کام کریں تو وہ بھی دوسروں کی تہذیب سے بڑھ کر تہذیب ہوگی، ان سب چیزوں کو ذہن سے نکال دیجئے، آپ وہاں جا کر پرانے رہنے والوں کے ساتھ شیر و شکر ہو جایئے۔

پاکستان اس وقت دنیا کے نقشہ پر اثر انداز ہو سکتا ہے اور اس وقت کوئی اہم کردار ادا کر سکتا ہے جب ایسا صحیح الترکیب معجون ہو ان عناصر کا جو باہر سے آئے ہیں یا یہاں کے رہنے والے ہیں، ان کو کوئی کسی سے امتیاز نہ کرے۔ یہ سب وہ خطرات ہیں جو اسپین میں تھے۔ وہاں قبائلی عصبیت نے گل کھلائے اور اپنا اثر دکھایا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائیت کا جو خطرہ ان پر تلوار کی طرح سر پر لٹک رہا تھا وہ اس کو بھول گئے۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کا تفوق ظاہر کرنے یا زیادہ سے زیادہ حکومت سے لینے یا اپنے قبیلے کے مفاد کی حفاظت میں لگ گئے، آج پاکستان میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اس سے زیادہ موزوں مجمع اس سے زیادہ موقر مجلس کوئی نہیں ہو سکتی جس میں اپنے اس اندیشے کا اظہار کروں کہ آپ کی اصلاح کی مہم ان عصبیتوں کو ختم کر دے اور ان عصبیتوں کو ختم کرنے کی صورت یہ نہیں ہے کہ ان عصبیتوں کی تردید کی جائے ہم اپنے طرزِ عمل سے اور اسلامی اتحاد اور عدل و مساوات سے جس کا ذکر کیا ہے چیمہ صاحب نے، اس کے قانون و مساوات پر عمل کر کے ہم ان عصبیتوں کو بالکل فنا کر دیں، کم سے کم پاکستان کی حد تک ہمارے سامنے صرف اسلام کا مسئلہ رہ ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت دنیا میں دو ہی محاذ ہیں، ایک محاذ ہے الحاد و کفر کا اور ایک محاذ ہے اسلام کا، اور اس میں ذرا سی بھی چوک ہوئی تو میں قرآن مجید کے وہی الفاظ دہراؤں گا جو مدینہ میں قائم ہونے والے چھوٹے سے

اسلامی معاشرے کو مخاطب کر کے کہے گئے تھے، مدینہ طیبہ میں جو معاشرہ بن رہا تھا وہ نہ صرف یہ کہ مہاجرین و انصار سے مرکب تھا بلکہ خود انصار کے دو قبیلے اوس و خزرج سے مرکب تھا اور مہاجرین اور انصار کے درمیان اتنی شکر رنجیاں اور اتنی تلخیاں، انتقامی جذبات، اتنی رنگین تاریخ، خون آلود تاریخ نہیں ہو گی جتنی اوس و خزرج کے درمیان، اوس خزرج تقریباً چالیس برس لڑ چکے تھے اور اب بھی ان کی آنکھوں میں خون بھرا ہوا تھا اور ذرا سے ایک شعر پڑھ دینے میں ان کے جذبات مشتعل ہو جاتے تھے۔ ایسا ہوا ہے کہ اوس و خزرج بیٹھے ہوئے ہیں اور کسی شاطر یہودی نے کسی کو بھیجا اور کہا کہ فلاں قصیدہ پڑھو اور اس نے پڑھنا شروع کیا اور قریب تھا کہ تلواریں نیام سے نکل آئیں اور آنکھوں سے معلوم ہوتا تھا کہ خون ٹپکنے لگے گا کہ اچانک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پہنچ گئے اور آپ نے ان کو اسلامی وحدت اور اسلامی اخوت کی طرف متوجہ فرمایا اور وہ آگ ٹھنڈی ہوئی۔ وہ معاشرہ جو اتنا چھوٹا سا تھا، ساری دنیا ایک طرف، ساری طاقتیں ایک طرف، بازنطینی اور ساسانی سلطنتیں ایک طرف تھیں، اس کے بعد کی سلطنتیں ہندوستان وغیرہ کو چھوڑ دیئے اور اس کے مقابلہ میں چند ہزار آدمیوں کا ایک مجموعہ ایک یونٹ، ایک وحدت تیار ہو رہی تھی۔ یہ وحدت بڑی طاقتوں کا کیا مقابلہ کر سکے گی، لیکن اس کو بھی آگاہی دی گئی کہ اگر تم نے اپنی وحدت کو مستحکم نہ کیا، اپنی اخوت کو مستحکم نہ کیا، إلا تفعلوه تكن فتنة في الأرض وفساد كبير......

اگر تم نے اس میں کوتاہی کی تو اس کوتاہی کی سزا دنیا میں یہ ملے گی کہ زمین میں فتنۂ عظیم و فساد کبیر برپا ہو گا۔ اب آپ خیال کیجئے کیا یہ لوگ ایسے تھے کہ جو انسانی قسمت پر ایسے اثر انداز ہو سکیں؟ لیکن انسانیت کی آس ان ہی لوگوں سے قائم تھی، انسانیت کا جوہر، انسانیت کی اصلاح کا جو بھی سرمایہ تھا صرف یہی لوگ تھے اسی لئے کہا گیا تم اگر ذرا سی غلطی کرو گے اور تمہاری وحدت و اخوت میں ذرا بھی رخنہ پڑا تو صرف یہی نہیں کہ تم فنا ہو جاؤ گے بلکہ تكن فتنة في الأرض وفساد كبير دنیا میں فتنۂ عظیم اور فساد کبیر برپا ہو گا۔ آپ سے کہتا ہوں کہ پاکستان میں اگر خدا نخواستہ ان عصبیتوں نے سر اٹھایا جن کا ہر وقت خطرہ رہتا ہے، جن کو EXPLOIT کیا جاتا ہے، جن سے ہر وقت لوگ کام لیتے ہیں تو پھر کوئی طاقت پاکستان کو بچا نہیں سکتی۔ نفاذِ شریعت کا تجربہ اگر خدا نخواستہ ناکام ہوا تو پھر دنیا کے کسی گوشے میں کوئی خدا کا بندہ اس

کا نام نہیں لے سکتا کہ شریعت کا نفاذ کیا جائے۔

میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مغرب اور پوری غیر اسلامی دنیا اس وقت ان ملکوں کی طرف دیکھ رہی ہے جہاں شریعت کے نفاذ کی آواز بلند ہو رہی ہے، یہ تجربہ اگر ناکام ہوتا ہے تو پھر میدان صاف ہے، اس لئے میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ بڑا نازک مرحلہ ہے اور اس مرحلہ پر آپ کو پوری توانائیاں، پوری ذہنی صلاحیتیں، اپنی قوتِ ارادی، ایثار و قربانی کا جذبہ، تعاون و اشتراکِ عمل، اختلاف کو پس پشت ڈال دینے کی ہمت اس پر مرکوز کر دینی ہے۔ آپ کو جماعتوں سے بالاتر ہو کر بلند تر ہو کر پاکستان کے مفاد اور اس سے بھی بالاتر ہو کر اسلام کے مفاد کو دیکھنا ہے، اگر آپ نے یہ شرائط پوری کر دیں تو تاریخ کا ایک نیا صفحہ پلٹے گا اور ایک نئے دور کا آغاز ہوگا، جب ایک ایسا معاشرہ قائم ہو جائے گا تو آپ دیکھیں گے کہ دنیا بھر کے سیاح ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے شاہد اور مبصر آپ کے ملک میں آئیں گے تاکہ اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور ساری دنیا میں بیان کر سکیں اور بتائیں کہ ہم نے ایک ایسا معاشرہ دیکھا ہے جہاں گناہ ناپید ہے، جہاں ہر فرد ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کرتا ہے جو ایک معیاری اور مثالی معاشرہ ہے، جہاں قلب کو سکون حاصل ہوتا ہے اور روح کو اطمینان نصیب ہوتا ہے اور جہاں پہنچ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں آ گئے ہیں، اس لئے میں صرف اس طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ یہ ہتھیلی پر سرسوں جمانے کا کام نہیں ہے کہ ایک رات میں سب کچھ ہو جائے۔ کاش ایسا ہو جاتا، آپ اس کے لئے وہ سب تیار کریں اور وہ سب قربانیاں دیں جو ایک ایسی نعمت کے لئے دینا چاہیئے جس پر انحصار ہے اسلام کی آئندہ ترقی کا اور آپ کے ملک کی قسمت کا۔

میں ان الفاظ کے ساتھ شکر گزار ہوں ان حضرات کا جنھوں نے مجھے ایسا زرین موقع فراہم فرمایا اور آپ کا کہ آپ نے یہاں تشریف لا کر میری عزت بڑھائی۔

علماء اور تعلیمیافتہ طبقہ کی ذمہ داریاں

یہ تقریر جامع مسجد فیصل آباد میں ۲۲ جولائی ۱۹۷۸ء کو علماء جدید تعلیمی اداروں کے اساتذہ، معززین شہر، اور مختلف دینی، سیاسی، سماجی، علمی، ادبی اور صحافتی حلقوں کے ذمہ دار حضرات کے ایک مخصوص و منتخب جلسہ میں کی گئی۔

مولانا مفتی سیاح الدین کاکاخیل (رکن اسلامی نظریاتی کونسل) نے خیر مقدمی تقریر فرمائی

حمد و ثنا کے بعد

حضرات علماء کرام اور اساتذۂ مدارس و جامعات!

قبل اس کے کہ آپ حضرات سے کوئی تفصیلی اور معین بات کہوں، ایک اصولی اور اجمالی بات کرنا چاہتا ہوں

علماء اور تعلیمیافتہ طبقہ کی ذمہ داریاں

اس وقت علماء اور تعلیمیافتہ طبقہ کی ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے، جب کسی دعوت یا کوشش کے ساتھ اعلیٰ طبقہ کے وہ لوگ جو ذہین اور صاحب فکر سمجھے جاتے ہیں اور جو دین کا گہرا علم رکھتے ہیں ہوتے ہیں تو اس میں سنجیدگی، گہرائی اور پختگی ہوتی ہے اور اس کے بارے میں یہ امید ہوتی ہے کہ وہ کسی غلط راستے پر نہیں پڑے گی، اس تحریک میں جذباتیت نہیں ہو گی۔ اس میں عامیانہ اور مبتذل انداز نہیں ہوگا۔ اس وقت عالم اسلام میں علماء کی اور دینی

جماعتوں اور قائدین کی ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے۔ یہ ذمہ داری ہر زمانے میں زیادہ رہی ہے لیکن اس زمانے میں وہ خاص طور پر بہت عظیم بن گئی ہے کہ وہ صحیح رہنمائی کریں گے اور تحریکِ دعوت اور جدوجہد کو سطحیت سے بچائیں گے، اس کے متعلق یہ تصور اور یہ تاثر قائم ہونے نہ دیں گے کہ دریا کا حباب ہے، بلکہ اس کے متعلق یہ تاثر دیں گے کہ اس کی جڑیں گہری اور علم و دین کی زمین میں پیوست ہیں۔

مسلم حکومتوں میں علماء کا کارنامہ

خلافتِ بنی امیہ و خلافتِ بنی عباس کی پشت پر اگر علماء و مجتہدین نہ ہوتے تو اسلام بہ حیثیت نظامِ حیات کے ایک مرتب و مدون قانون کی شکل میں موجود نہ ہوتا۔

تاریخ میں ان لوگوں کی خدمات کو سراہا جاتا ہے جو ملک فتح کرتے ہیں۔ ہمارے بڑے بڑے قائدین طارق بن زیاد، محمد بن قاسم، عقبہ بن نافع، موسیٰ بن نصیر وغیرہ حضرات کی خدمات روزِ روشن کی طرح تابناک ہیں، لیکن جو لوگ مفتوحہ ممالک میں اللہ کے قانون کو رائج کرتے تھے اور وہاں کی مشکلات و مسائل کو حل کرتے تھے وہاں کی پیش آمدہ ضروریات کی تکمیل کرتے تھے، نئے نئے حالات جو پیدا ہوتے تھے ان میں رہنمائی کرتے تھے، ان کی خدمات کو بہت کم لوگ جانتے ہیں، حالانکہ اگر ائمہ مجتہدین، محدثینِ عظام، اس زمانہ میں محنت کرتے اور ان کا دماغ اس تلوار کے پیچھے نہ ہوتا جو ملک کو فتح کرتی تھی اور اس حکومت کے پیچھے نہ ہوتا جو ملک میں نظم و نسق قائم کرتی تھی تو یہ سب کوششیں، فتوحات اور سلطنتیں بالکل کھوکھلی تھیں۔

مسلمانوں کے فاتح اسلام کے مفتوح

مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ تاتاریوں نے عالمِ اسلام کو زیر و زبر کر ڈالا، عالمِ اسلام کی چولیں

ہلادیں، اس وقت مسلمانوں سے زیادہ ذلیل کوئی نہیں تھا، آپ اس زمانہ کی تصاویر دیکھیں جو آثارِ قدیمہ میں ملتی ہیں تو ان سے اندازہ ہوگا کہ کسی مسلمان کی داڑھی کسی گھوڑے کی دم سے بندھی ہے اور ایک تاتاری اسے کھینچے لئے جا رہا ہے، دنیا کی ہر قوم ان کی نگاہ میں عزت رکھتی ہے لیکن مسلمانوں سے زیادہ کوئی ذلیل نہ تھا اور خاص طور پر اس خطۂ زمین کے مسلمان جو مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت کا مرکز رہ چکا تھا، یعنی ایران اور ماوراء النہر کا علاقہ جو آخر میں فقہ کا (خاص طور سے فقہ حنفی) کا مرکز رہا ہے، لیکن آپ حضرات اس سے واقف ہیں کہ وہی تاتاری جو مسلمانوں کے فاتح تھے، اسلام کے مفتوح بن گئے اور جن کو مسلمانوں کی تلوار شکست نہ دے سکی، ان کو مسلمانوں کی تہذیب نے، مسلمانوں کی ثقافت نے، مسلمانوں کے علم نے تسخیر کر لیا، اور ان کو اپنا بے دام غلام بنا لیا، بات یہ تھی کہ تاتاریوں کے پاس کوئی علمی ذخیرہ، کوئی شائستہ تہذیب اور کوئی مرتب و وسیع قانون نہ تھا، ان کا ایک سیدھا سادا روایتی قانون تھا جو قبائلی زندگی میں رائج تھا اور کوہ قراقرم اور اس کے اطراف میں اس کا عمل دخل تھا، نیم وحشی اقوام میں جیسے "عرف" ہوتے ہیں وہ ویسے تھے، ان کے پاس کوئی آئین، کوئی تہذیب، کوئی لٹریچر نہیں تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو مسلمان علماء اور دانشوروں کی ضرورت پڑی، مسلمان علماء اور دانشور جب ان کے دربار میں پہنچے تو ان کی علمیت کا، ان کی ذہانت کا سکہ ان کے دلوں پر بیٹھ گیا، اسلامی تہذیب نے ان کو اپنا گرویدہ بنا لیا، نتیجہ یہ ہوا کہ تاتاری من حیث القوم مسلمان ہو گئے، مسلمان چونکہ صاحب دماغ تھے، ان کے پاس ذہانت کے سرچشمے تھے، ترقی یافتہ تہذیب تھی، ایک وسیع ثقافت اور علمی ذخیرہ تھا، وہ آئین سازی کا تجربہ رکھتے تھے، تمدنی مشکلات و مسائل کو حل کر سکتے تھے، تاتاریوں کو ان کی ضرورت پیش آئی، فلسفۂ تاریخ کا یہ ایک اہم اصول ہے کہ جنگی طاقت اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک اس کے پیچھے دماغ نہ ہو، آئین سازی کی طاقت نہ ہو اور کوئی منظم ادارہ نہ ہو

یہ دین جہالت سے نہیں بلکہ علم سے پیدا ہوا ہے

عصر جدید میں عالم اسلام کے علماء جامعات کے اساتذہ اور پروفیسر صاحبان، اور ہمارے قانون داں اور

ہمارے ادیب و دانشور طبقہ کے ایک ذمہ داری تو یہ ہے کہ وہ یہ ثابت کریں کہ یہ دین جہالت کے بطن سے اور فوجی طاقت سے نہیں پیدا ہوا ہے، معرفت سے پیدا ہوا ہے، اللہ کی رہنمائی سے پیدا ہوا ہے، وحی سے پیدا ہوا ہے، یہ زمانے کا ساتھ دے سکتا ہے، یہ تمدن کی رہنمائی کر سکتا ہے، اس کی نگرانی کر سکتا ہے کہ یہ تمدن بے راہ نہ ہونے پائے، فاسد نہ ہونے پائے، تخریبی راستہ اختیار نہ کرنے پائے، یہ بات صرف علماء دین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ ہی دے سکتا ہے اور یہ بڑی ذمہ داری ہے اگر کسی دین یا کسی قوم کے متعلق یہ خیال قائم ہو جائے کہ اس کا علم کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں ہے بلکہ علم سے اس کو نقصان پہنچا ہے اور جہالت سے اسکو فائدہ، تو خواہ تھوڑے عرصے کے لئے اپنے زور شمشیر اپنے بازو سے وہ دعوت یا جماعت یا قوم دنیا کے کسی حصے پر قبضہ کرلے لیکن دماغوں پر اس کا قبضہ نہیں ہو سکتا، سب یہی خیال کریں گے کہ اس کو زندہ رہنے کے لئے جہالت کی تاریکی چاہیئے، جب تک وہ تاریکی رہے گی، وہ زندہ رہے گا، اور جب علم آئے گا وہ غائب ہو جائے گا، اس کا پردہ چاک ہو جائے گا اور جس طرح بدلی آفتاب کی روشنی سے چھٹ جاتی ہے اسی طرح وہ چھٹ جائیگا، عیسائیت کا معاملہ یہی ہوا، عیسائیت نے علم کا ساتھ نہیں دیا، عیسائیت ایک خالص روحانی تحریک اور ایک معاشرتی انقلاب کے طور پر آئی حضرت مسیح علیہ السلام کا جب تک زمانہ رہا، ان کی مقبولیت، ان کا تقدس، ان کی روحانی طاقت رہنمائی کرتی رہی، لیکن اس کے بعد پھر اسکو ایک زمانہ تک ذہین اور صاحب نظر لوگوں کا تعاون حاصل نہ ہوا، پھر جب مسیحیت یورپ پہنچی تو سمجھا گیا کہ یہ زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتی، اس لئے زندگی سے اسکو علیحدہ کر لینا چاہیئے۔

عیسائیت مستقل شریعت نہیں رکھتی تھی

یورپ اس وقت ترقی کر رہا تھا، یورپ کے اندر ترقی کی طاقتیں اور ولولے جوش مار رہے تھے، یورپ میں تنازع للبقاء کے لئے سخت کشمکش تھی، اگر پلک ذرا جھپک جاتی تو یہ قوم کی قوم بالکل مغلوب ہو جاتی، عیسائیت جو ابھی بالکل اپنے دور طفولیت میں تھی، جس کی ابھی نہ تدوین تھی نہ تشریح، نہ اس کے پاس آئین تھا، آئین میں وہ سارا انحصار یہودیت

پر کرتی تھی مسیحیت اپنے ساتھ کوئی مستقل شریعت نہیں رکھتی تھی، شریعت موسوی تھی جس میں جزوی تبدیلی کی گئی تھی، وَلِاُحِلَّ لَکُمۡ بَعۡضَ الَّذِیۡ حُرِّمَ عَلَیۡکُمۡ کہا گیا ہے، یہ نہیں کہا گیا ہے کہ میں تمہارے لئے مستقل شریعت لے کر آیا تو جو چیزیں یہودیت میں غلط طور پر داخل ہو گئی تھیں مسیحیت ان کی اصلاح کرتی تھی، اس کے پاس مستقل کوئی آئین نہیں تھا اور اس کا زیادہ تر زور رحم پر، محبت پر، انسان دوستی پر، مظلوموں پر شفقت پر، اجارہ داری اور اسکے غرور کو ختم کرنے پر تھا، جب یورپ جیسے بے چین ملک اور وہاں کی بے چین قوموں میں جو زندگی کے لئے دوڑ رہی تھیں مچل رہی تھیں، عیسائیت پہنچی تو یہ حقیقت بہت جلد منکشف ہو گئی کہ عیسائیت بدلتے ہوئے زمانہ اور دوڑتے ہوئے معاشرے اور ابلتے ہوئے علم کا ساتھ نہیں دے سکتی، اسی وقت مسیحی علمار کی بہت بڑی ذمہ داری تھی کہ وہ مسیحیت کی افادیت کو ثابت کرتے اور رہنما اصول دیتے، زمانہ کے جائز تقاضوں اور فطرت انسانی کی جائز خواہشات کو قبول کرتے اور کہتے کہ یہ ٹھیک ہے لیکن اس کے ساتھ مذہب کی ہدایت اور نگہبانی چاہیئے، یہ انھوں نے نہیں کیا، وہ دو گروہوں میں بٹ گئے، حاکمانہ گروہ نے مسیحیت کو بس عقیدہ کے طور پر تسلیم کیا، اور باقی زندگی کو آئین کو آئین سازی کو کھلی چھوٹ دیدی، دوسرا طبقہ علمار کا تھا، انھوں نے مخالفت شروع کردی اور کہا ترقی ضروری نہیں ہے، بلکہ ترقی زندگی سے فرار میں ہے کلیساؤں میں جانے میں جنگلوں میں چھپ جانے میں، شادی نہ کرنے میں ازدواجی زندگی سے منہ موڑ لینے میں، عورت کے سایہ سے بھاگنے میں ہے اور اسی میں روحانیت کا بچاؤ ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں طبقوں نے عیسائیت کو فائدہ پہنچانے کے بجائے نقصان پہنچایا، جو حاکم طبقہ تھا، اس نے آزادی کے ساتھ اپنے تمدن کا ڈھانچہ بنانا شروع کیا، لوگوں کو غلام بنانا شروع کیا، جو مسیحیت کی تعلیم کے خلاف تھا اس نے مسیحیت کو بدنام کیا، سینٹ پال کے زمانہ سے یہ سلسلہ شروع ہوا اور یہ تقریباً چوتھی صدی عیسوی سے آج تک جاری ہے، یورپ اسی راستے پر گامزن ہے نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے کلیسا سے رشتہ توڑ لیا، کلیسا اور ریاست میں ہمیشہ کے لئے جدائی ہو گئی اور عیسائیت سمٹتے سمٹتے ایک نقطہ ہو گئی۔

اسلام اور علم کا چولی دامن کا ساتھ ہے

یہ غلطی عالم اسلام میں الحمدللہ نہیں ہونے پائی، اس لئے کہ شروع سے اسلام اور علم کا چولی دامن کا ساتھ تھا، میں نے کراچی یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ جس کی پہلی وحی "اقرأ" کے لفظ سے شروع ہوئی ہو اور جس کی پہلی وحی میں قلم کو فراموش نہ کیا گیا ہو وہ علم اور قلم کا ساتھ کیسے چھوڑ سکتا ہے؟ اسلام میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے کہ دین و علم میں کبھی بھی دوری ہوگی، اس لئے کہ اسلام اور علم کا شروع سے ساتھ رہا ہے، جب بدر کے قریشی قیدی مدینہ پہنچے تو ان میں کئی ایسے تھے کہ وہ فدیہ ادا کر کے رہائی نہیں حاصل کر سکتے تھے، ان کا فدیہ یہ مقرر کیا گیا کہ ہر شخص انصاریوں اور مہاجرین کے دس دس بچوں کو پڑھنا لکھنا سکھا دے۔

اسلام زمانہ کا رفیق ہی نہیں بلکہ راہ نما ہے

اس وقت عالم اسلام میں اہل علم کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ تھی کہ یہ تاثر نوجوان طبقہ میں نہ آنے پائے کہ اسلام محض طاقت اور حکومت کے بل پر قائم رہ سکتا ہے، وہ زمانہ کی تبدیلیوں اور علم و فن کی ترقیوں کا ساتھ نہیں دے سکتا، وہ اس زمانہ میں چلنے والی چیز نہیں، وہ ابتدائی، سادہ اور محدود زمانہ کا ساتھ دے سکتا تھا جب انسانیت عہدِ طفولیت میں تھی، لیکن اس پر پیچ، ترقی یافتہ اور وسیع تمدن کے دور میں اسلام زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتا، سب سے بڑی خدمت علماء کی یہ تھی کہ اسلامی ملکوں میں اس چیلنج کو قبول کرتے اور اپنی ذہانت سے، گہرے مطالعہ سے، اصولِ فقہ سے کام لینے کی صلاحیت سے، کتاب و سنت کے ان ازلی اور لافانی اصولوں کی مدد سے جو ہر زمانہ میں نسل انسانی کی رہنمائی کر سکتے ہیں، اس تمدن کو اسلام کے اصولوں کے مطابق رکھنے کی کوشش کرتے، اس میں اگر کسی ملک میں ذرا بھی کچھ کمی ہو گئی، اس کا نتیجہ کم سے کم جو ہو سکتا ہے وہ بے علمی اور شریعت کے خلاف زندگی ہے، اور بڑے سے بڑا نقصان جو ہو سکتا ہے وہ الحاد اور دین سے بغاوت ہے۔ کسی اسلامی ملک میں آپ دیکھیں گے کہ دوسرا نتیجہ ظاہر ہوا اور

کسی اسلامی ملک میں دیکھیں گے کہ پہلا نتیجہ ظاہر ہوا، حالانکہ دونوں نتیجے اسلام کے حق میں سمّ قاتل ہیں۔ سب سے بڑا کام اس وقت یہ ہے کہ ہم یہ ثابت کریں کہ اسلام اپنی اسی روح اور مقاصد کے ساتھ اور اپنے انھیں اصولوں کے ساتھ زندگی کا نہ صرف ساتھ دے سکتا ہے بلکہ رہنمائی کرسکتا ہے، ساتھ دینا تو میں نے علی سبیل التنزّل کہا وہ تو بہت ہی گھٹیا درجہ ہے، یہ اسلام کی کوئی تعریف نہیں ہے کہ وہ زندگی کا ساتھ دے سکتا ہے، نہیں بلکہ وہ نئی زندگی کی رہنمائی کرسکتا ہے، اس کو خطروں سے صرف وہی بچاسکتا ہے اور وہ تمدن صحیح انسانی تمدن نہیں اور وہ ریاست معتدل اور محفوظ ریاست نہیں جو اسلام کے اصولوں سے ہٹ جائے، یہ ثابت کرنا ہمارا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

اِسلام کو ہر مفاد پر ترجیح دیجئے

علماء اور دانشوروں کا دوسرا فریضہ یہ ہے کہ اسلام کے مفاد کو ہر جماعت، ہر ادارہ، ہر مدرسہ اور ہر گروہ کے مفاد پر ترجیح دیں، میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ اگر ہمیں معلوم ہو کہ سب جماعتوں کو مٹا دینا پڑے گا، سارے نشانوں کو نکال دینا پڑے گا، سارے ناموں کو ختم کردینا پڑے گا، سارے بورڈوں کو مٹا دینا پڑے گا اور اسلام اس ملک میں غالب رہے گا تو ہمیں ایک منٹ بھی اس میں پس وپیش نہیں ہونا چاہیئے۔ ہمیں دین وملّت کا مفاد ہر جماعت سے عزیز ہونا چاہیئے، سہرا کسی کے سر بندھے سہرا ہونا چاہیئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ یہ تھا کہ صحابۂ کرام کے دل سے یہ شوق نکل گیا تھا کہ ان کا کارنامہ سمجھا جائے۔

بخاری کی روایت ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے ایک مجلس میں واقعہ کے طور پر ذکر کیا کہ ہم لوگ ایک غزوہ میں گئے تھے، وہاں ہمارے پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے ہم نے چیتھڑے لپیٹ لئے، اسی وجہ سے وہ غزوہ ذات الرقاع کہلاتا ہے، یہ کہنے کے بعد ان کو ایک دم سے یہ احساس ہوا کہ میں نے یہ کیوں کہا، کہیں میرا یہ عمل باطل نہ ہو گیا ہو، کہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ نہ کہہ دیا جائے کہ لوگوں نے سُن لیا، اور بڑا مجاہد سمجھا، یہ کافی ہے، اب ہم سے کیا لینے آئے ہو؛ تو بخاری شریف میں خاص طور سے ہے کہ انھوں نے کہا کہ کاش

میں یہ نہ کہتا، ان کو اس کا افسوس رہا، آج اس پر زیادہ زور ہے کہ یہ کارنامہ کس کی طرف منسوب ہوگا، ایک صاحب تھے غازی محمود دھرم پال آپ ہی کے پنجاب کے، مجھے ان کا ایک لطیفہ یاد آگیا، ایک تقریر میں کہنے لگے اخباروں میں چھپتا ہے کہ فلاں آدمی فلاں صاحب کے دستِ حق پرست پر اسلام لایا، تاکہ اس کے اسلام قبول کرنے کے ساتھ ان کے دست حق پرست کی بھی شہرت ہو جائے، بلکہ دست حق پرست کی شہرت زیادہ منظور ہے۔ قبولِ اسلام کی شہرت ہو یا نہ ہو، یہاں تک کہ بعض لوگوں کو میں نے دیکھا ہے کہ کسی بڑے آدمی کا جنازہ ہوتا ہے لپک کر پہنچ جاتے ہیں جنازہ کی نماز پڑھانے کے لئے، اس لئے کہ اخبار میں کل یہ خبر چھپ جائے گی، یہ جذبہ بڑا نقصان پہنچاتا ہے، دیکھئے جب کسی کا عزیز جاں بلب ہوتا ہے تو اس کے عزیزوں میں کسی کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ تعریف کس کی ہو، سب کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ ہمارا مریض بچ جائے حکیم کے سر سہرا بندھے یا ڈاکٹر کے، تو اس وقت عالمِ اسلام بیمار ہے، آپ کا ملک بیمار ہے، آپ اس وقت بھول جائیے کہ کس کے حساب میں لکھا جائے گا اور تاریخ میں لکھنے والے کیا لکھیں گے کہ اس ملک کو سب سے زیادہ نفع فلاں ادارہ، فلاں جماعت سے پہنچا اور اس میں سب سے بڑا حصہ ان کا تھا، تاتاریوں کے بارے میں آج تک یہ ثابت نہیں ہو سکا کہ ان کو مسلمان کرنے میں سب سے بڑا حصہ کس کا تھا، اس لئے کہ ان مخلصین نے جنھوں نے یہ خدمت انجام دی تھی اپنے کو اتنا چھپایا کہ تاریخ کی باریک بیں نگاہ بھی ان کو نہیں دیکھ سکی۔

اس وقت جو لڑائی لڑی جا رہی ہے، اس ملک کو اسلامی آئین دینے کی اسلامی معاشرت و تمدن میں ڈھالنے کی، اور یہاں سے ان خرابیوں کو دور کرنے کی جو مغربی تمدن نے اور ہمارے سیاستدانوں نے داخل کر دی ہیں، اس لڑائی میں فوج کے ادنیٰ سپاہی بن جائیں۔ خالص اللہ کی رضا کے لئے کام کیجئے، اللہ کے یہاں آپ کا نام اس کے نورانی دفتر میں لکھا جائے گا، یہاں ہوا تو کیا اور نہ ہوا تو کیا۔ اس وقت لڑائی کسی مکتبِ خیال کی نہیں ہے، اس وقت لڑائی اسلام اور غیر اسلام کی ہے، اس طرح سمجھئے کہ ایک مسجد تعمیر ہو رہی ہے اس میں

جو بھی شریک ہو جائے سب اجر میں شریک ہوں گے، اس میں یہ کس کا کتنا حصہ ہے اور کس کا نام پہلے ہے اور کس کا نام بعد میں ہے یہ نہیں ہونا چاہیئے، اس جذبہ کو جہاں تک ہو سکے مغلوب کرنا چاہیئے، اپنے اپنے مسلک پر پورے طور پر قائم رہنا چاہیئے، جسے ہم حق سمجھتے ہوں اس کو حق سمجھنا چاہیئے، اس سے ہٹنے کی ضرورت نہیں ہے، سودا کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن سب دعوت اسلامی کا محاذ اور اسلامی زندگی پیدا کرنے کا محاذ بنائیں، اس ملک میں اسلامی زندگی پیدا ہو اور وہ آنکھوں سے دیکھی جا سکے اور یہ ملک دوسروں کے لئے نمونہ بنے۔

ایثار و قربانی

تیسری بات یہ کہ ہم جتنا بھی ہو سکے ایثار سے کام لیں اور باہمی نزاع سے پرہیز کریں، ہماری زندگی جتنی سادہ ہوگی، ہماری زندگی میں جتنی قربانی ہوگی، اتنا ہی اثر پڑے گا، اتنا ہی بہتر نتیجہ نکلے گا، سب سے خطرناک بات آپس کی نزاع ہے، ہماری آپس کے دینی مباحث کا میدان اور ہے اس کے کہنے کا موقع اور ہے حضرت مجدد الف ثانی" نے مکتوبات میں لکھا ہے کہ اکبر اس لیے دین سے متنفر ہوا کہ اس نے علماء کو مرغوں کی طرح لڑتے دیکھا۔ اگر کوئی مسئلہ چھڑتا تو ان میں آپس میں اتنی تیز بحث ہوتی اور ہر ایک دوسرے پر اپنا تفوق اس طرح ظاہر کرنے کی کوشش کرتا جیسا کہ نکمے دنیا والے اور جاہ طلب کرتے ہیں اکبر نے سوچا کہ یہ کیسے لوگ ہیں۔ یہ ہمارے وزراء، ارکان سلطنت اور خالص دنیا دار لوگ بھی اس سطح پر نہیں آتے، جب حضرت مجدد صاحب" کو یہ معلوم ہوا کہ جہانگیر کا ارادہ ہے کہ وہ چند علماء کو اپنے دربار میں مشورہ کرنے کے لئے رکھے تو انھوں نے نواب سید فرید کو خط لکھا کہ خبردار خبردار! بادشاہ کو رائے دو کہ مخلص اور حقانی عالم صرف ایک آدمی کو رکھے، یہ مجدد صاحب کی فراست ایمانی تھی جو انھوں نے اس بات کو سمجھا، میں نہیں کہتا کہ ہر موقع اور مجلس میں صرف ایک ہی عالم رہے، لیکن میں کہتا ہوں کہ علماء کے آپس کے نزاعات اور بحث اور نفی کرنے سے اور ایک دوسرے کی تذلیل

کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔

خطرے کے اظہار کرنے کا بہرحال ہر شخص کو حق ہے' ایک بچہ بھی خطرہ کا اظہار کر سکتا ہے کہ یہ دروازہ کھلا رہ گیا ہے چور نہ آجائے، اس طرح میں یہ دو تین چیزیں آپ سے کہتا ہوں کہ ایک تو آپ جدید تعلیمیافتہ طبقے کو یہ تاثر نہ لینے دیں کہ کتاب و سنّت اور اس کی تشریحات میں فقہ کا اور اصول فقہ کا جو ذخیرہ ہے وہ موجودہ تمدن کا ساتھ نہیں دے سکتا، موجودہ مسائل حل نہیں کر سکتا، یہ خیال بڑا خطرناک ہے، یہ الحاد تک پہنچا سکتا ہے' دوسری بات یہ ہے کہ آپ عمل سے عوام پر اور خواص پر جو حکومت میں ہیں یہ تاثر دیں کہ آپ کی سطح بلند ہے عوام کی سطح سے، آپ کی زندگی میں سادگی نظر آئے' وہ دیکھیں کہ آپ تھوڑی چیز پر قناعت کر رہے ہیں، یہ نہیں کہ آپ چاہیں کہ آپ کی بڑی بڑی تنخواہیں ہوں اور گریڈ ہوں اور جو تنخواہیں وزراء کو مل رہی ہیں اور ان کو جو فوائد اور مواقع حاصل ہیں وہ ہم کو بھی حاصل ہوں، ہماری کیڈلک کار ہو، ہمارے پاس بھی کوٹھی ہو اور وہ کسی وزیر کی کوٹھی سے کم نہ ہو، بلکہ صاف صاف میں یہ کہوں گا کہ کوئی بوریہ نشین ہو تو زیادہ کام کر سکتا ہے' اس لئے کہ یہ طبقہ اسی کے سامنے جھکتا ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ کوئی بہ تکلف بوریہ نشین بنے، میں اس کی تعلیم نہیں دیتا، لیکن یہ واقعہ ہے، یہ طبقہ اسی کے سامنے آکر جھکتا ہے اور رہا ہے جس کو سب سے زیادہ بے نیاز دیکھتا ہے حضرت مجددؒ کے سامنے وقت کے شہنشاہ کیوں جھکے؟ اس لئے کہ یہ اللہ کا بندہ نہ کبھی کسی کی سفارش کرتا ہے اور نہ کبھی دربار میں آتا ہے بیٹھا اللہ اللہ کرتا ہے، بیٹھے بیٹھے مشورہ دیتا ہے' ہمارے تمام مشائخ نے یہی کیا، کبھی بادشاہوں کے قریب نہیں گئے مگر دور سے نگرانی کرتے رہے' حکومت کو اچھے آدمی دیتے رہے، دعا کرتے رہے، ان کے حق میں مشورہ دیتے رہے' لیکن وہ کہتے تھے کہ آگ کو دور سے تاپو تب تو ٹھیک ہے' اگر ہاتھ ڈال دو گے تو جل جاؤ گے۔

یہ چند باتیں ہیں جو میں نے مختلف موقعوں پر عرض کی ہیں، سب کا ماحصل یہی ہے کہ اس وقت بڑا امتحان ہے ہمارا، پھر عالمِ اسلام کا امتحان ہے، ہمیں اپنی صلاحیت کا ثبوت دینا چاہیئے، کہیں ہماری صلاحیت

کی کمی سے اسلام کو نقصان نہ پہنچ جائے کوئی یہ نہ کہے اور لکھے کہ علماء کی عدم صلاحیت سے یہ ہوا۔ بس اتنی باتیں بہت معذرت کے ساتھ آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں۔..... اللہ تعالےٰ مجھے اور آپ کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔

خُدا کی بستی دوکان نہیں ہے

یہ تقریر ۲۷ جولائی ۱۹۷۸ء کو محکمۂ اوقاف کے صدر دفتر لاہور میں علماء، وکلاء اور دانشوروں کے سامنے اس استقبالیہ میں کی گئی جو محکمۂ اوقاف نے مقرر کر دیا تھا۔

بعد حمد و صلوٰۃ :-

یہ دُنیا ایک مقدّس وقف ہے

حضرات علماء کرام، کارکنانِ محکمۂ اوقاف و حاضرینِ مجلس!

میں محکمۂ اوقاف کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے یہاں دعوت دے کر میری عزت افزائی کی، مجھے جب یہ دعوت ملی تو میں یہ سمجھا کہ ایک محدود تعداد میں وہ حضرات ہوں گے جن کا محکمۂ اوقاف سے ذمہ دارانہ تعلق ہے، ان سے تعارف ہوگا اور میں محکمۂ اوقاف کی کارگزاری یا اس کی سرگرمی کے جو میدان ہیں ان سے واقفیت حاصل کر کے مسرت حاصل کروں گا اور اپنی معلومات میں اضافہ کروں گا، لیکن جب یہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ آج اس تقریب اور اس اجتماع کا موضوع ہے "موجودہ دنیا میں اسلام کی ضرورت"۔ میں سوچتا رہا کہ اس موضوع سے اس قابل قدر محکمے کا کیا تعلق ہے؟ لیکن میں نے فوراً ہی اس تعلق کا انکشاف کر لیا کہ حقیقت میں ہماری یہ دنیا بھی ایک مقدس وقف ہے اور اس کے متولی بھی حقیقت میں وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اس وقف کے مقصد

سے واقف ہوں اور واقف کے مقاصد و منشا سے ان کو نہ صرف دلچسپی ہو بلکہ وہ اس کے وفادار بھی ہوں۔

اس وقت دنیا کا حال یہ ہے کہ دنیا ایک ایسا مظلوم وقف ہے جس کے متولی اسکے مقاصد سے بالکل نا آشنا ہیں بلکہ اس میں بھی میں نے بڑی احتیاط برتی ہے، واقعہ یہ ہے کہ وقف کے مقصد و منشا کے مخالف ہیں اور ابھی تک یہ بھی پوری طرح نہیں کر سکے کہ اس عالمِ انسانی اور اس کائنات کا واقف ہے کون؟ آپ حضرات کو خوب معلوم ہے اور عملی تجربہ ہے کہ سب سے پہلے تو واقف کا علم ہونا چاہیئے، پھر واقف کا مقصد و منشا معلوم ہونا چاہیئے، پھر یہ جذبہ پیدا ہونا چاہیئے کہ ہم اس کے امین ہیں قرآن مجید میں اس "تولیت" کے لئے مختلف الفاظ آئے ہیں مثلاً ایک جگہ بہت واضح طریقہ پر فرمایا وَ انفقوا مما جعلکم مستخلفین فیه - یہ استخلاف بھی ایک طرح کی تولیت ہے کہ خالقِ کائنات نے اس زمین کو پیدا کیا اور اس پر انسان کو بسایا، نسلِ انسانی کو پیدا کیا اور فرمایا "ھوالذی خلق لکم مافی الارض جمیعاً" یہ کہا کہ تم اصالتاً اس کے مالک نہیں ہو، بلکہ ہمارے خلیفہ کی حیثیت سے ہمارے منشا کے مطابق اس کا انتظام کرنے کے مکلّف و ذمہ دار ہو چھوٹے سے چھوٹے وقف کے لئے بھی قانون بنا ہوا ہے اور اس کے بھی ضابطے ہیں اور میں جس جگہ سے اپنی یہ معروضات پیش کر رہا ہوں یہ اس کا ایک مرکزی مقام ہے جس کی بنیاد اس پر ہے کہ ان اوقاف کی حفاظت کی جائے اور میں پوری توقع کرتا ہوں کہ آپ اس کے امین ثابت ہو رہے ہوں گے لیکن یہ بدقسمت سرزمین اور یہ مظلوم وسیع ترین وقف جس کی کوئی نظیر اوقاف کی تاریخ میں نہیں مل سکتی، اس لئے کہ اوقاف کی تاریخ تو بہت بعد کی ہے، خدا نے یہ کرۂ ارض، یہ سیارہ ایک وقف کی حیثیت سے بہت پہلے پیدا کیا تھا اور انبیاء علیہم السلام کو، ان کی امتوں کو اور ان کے جانشینوں کو اس کا متولی بنایا تھا، یہ بھی ایک محکمۂ اوقاف تھا اور اس کے بعد آخری طور پر سید الانبیاء خاتم النبیین اشرف المرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فداہ ارواحنا ونفوسنا کو اور ان کی امت کو آخری طور پر اس کا متولی بنایا گیا۔

اُمّت خودرو کھیتی اور جنگلی گھاس نہیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خصوصیت ہے کہ اور انبیاء علیہم السلام کی بعثت منفرد بعثت ہوتی تھی، ان کی ذات کی بعثت ہوتی تھی، لیکن آپ کی بعثت کی خصوصیت یہ ہے کہ آپ کے ساتھ ایک امت بھی مبعوث کی گئی یعنی وہ امت خودرو کھیتی اور کوئی جنگلی گھاس نہیں ہے، حشرات الارض کا کوئی مجموعہ نہیں ہے بلکہ اس کے لئے قرآن مجید میں، سنتِ نبوی میں، احادیثِ صحیحہ میں جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ ذمہ داری کے الفاظ ہیں اور انتہائی ذمہ داری کا اظہار ان الفاظ سے ہوتا ہے، چنانچہ فرمایا:-

كنتم خير امة اخرجت للناس

"اُخرِجَت" کا لفظ بتاتا ہے کہ یہ امت کسی مقصد کے لئے پیدا کی گئی ہے، انسانیت کی حفاظت اور فاطرِ کائنات کے مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے خلیفۃ اللہ کی حیثیت سے، اور حدیث میں اس سے بھی زیادہ واضح اور صریح الفاظ ہیں کہ فرمایا: "انما بعثتم مُيَسِّرِينَ ولَمْ تُبْعَثُوا مُعَسِّرِيْنَ" اس میں بعثت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے کہ تم بھیجے گئے ہو، تمھیں مقرر کیا گیا ہے، تمھیں نامزد اور نصب کیا گیا ہے، تمھاری ایک حیثیت متعین کی گئی ہے اور تمھاری ڈیوٹی لگائی گئی ہے اور "مُيَسِّرِيْن" سہولت پیدا کرنے والے کی حیثیت سے مشکلات پیدا کرنے والے کی حیثیت سے نہیں۔ اگر ایک چھوٹے سے چھوٹا وقف ضائع ہو رہا ہو تو حکومت اس کی ذمہ دار ہوتی ہے، حکومت اس کی مدعی بن جاتی ہے، وقف کی حفاظت کے لئے خواہ وہ مسجد کی شکل میں ہو چاہے یتیم خانہ کی شکل میں، خواہ کسی جائیداد کی شکل میں ہو، حکومت اپنے پورے اختیارات سے اور تمام وسائل سے کام لیتی ہے اور آپ کو دن رات ان واقعات سے واسطہ پڑتا ہے۔

خدا کی بستی دُکان نہیں ہے

لیکن کیسی قابلِ رحم حالت ہے اس وقف کی جس کے متوَلّی غلط تصرّف کر رہے ہیں، بلکہ اس کے مالک

بن بیٹھے ہیں اور مالک بننے کے باوجود اس کے ساتھ دشمنوں کا سا سلوک کر رہے ہیں، قبرستانوں کا جیسا سلوک کر رہے ہیں، کسی قبرستان کا وہ حشر نہیں ہوگا جو اس معمورۂ جہاں کا حشر ہوا، اس آبادی کو ویرانہ اور قبرستان بنا دیا گیا۔ بقول اقبال ؎

"جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

آپ کے اسی شہر کے شاعر عظیم نے اہل یورپ کو خطاب کر کے کہا تھا ع

"خدا کی بستی دکاں نہیں ہے"

آپ کسی مسجد کو قمار خانہ بنتا نہیں دیکھ سکتے، لیکن وہ سرزمین جس کے متعلق کہا گیا تھا۔ جعلت لی الارض مسجداً و طہوراً میرے لئے پوری زمین مسجد بنا دی گئی ہے۔ اس مسجد کو فرنگیوں نے قمار خانہ بنا دیا۔

میں سمجھا کہ یہ موضوع مقرر کرنے والوں نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیا ہے، اور اس وقف سے اس بڑے وقف کی طرف توجہ دلائی ہے، یہ آپ کے موضوع سے بالکل غیر متعلق نہیں ہے، آپ اس دنیا کی حالت پر نظر ڈالیں اور دیکھیں اس دنیا کے ساتھ کیا سلوک کیا جا رہا ہے، جن کو تعمیر کا کام کرنا چاہئے تھا، وہ تخریب کا کام کر رہے ہیں، جن کو اسے امانت سمجھنا چاہیئے تھا وہ اس کو ذاتی ملکیت نہیں بلکہ میراث سمجھ رہے ہیں۔ جن کو اس میں اس کی ضروریات اور وہاں رہنے والوں کے جذبات کا خیال رکھنا چاہیئے تھا وہ ان کے جذبات اور ان کی ضروریات کے کھنڈر پر یا ان کے مقبروں پر اپنی عیش گاہیں تعمیر کر رہے ہیں، اس وقت دنیا کی صورت کیا ہے؛ کسی وقف کا وہ برا حال کبھی نہیں ہوا ہوگا جو اس وقت اس عظیم بلکہ وقف اعظم کا ان لوگوں نے کر دیا ہے جو اس کے متولی بن بیٹھے ہیں۔ جو متولی نہیں بنائے گئے، غاصب ہیں، انھوں نے اس دنیا کی قبریں کھودنی شروع کر دیں اور پرانی قبریں ہی نہیں نئی قبریں بنانی شروع کیں اور افراد کی نہیں بلکہ قوموں اور ملکوں کی قبریں کھودنی شروع کر دی ہیں، اب تو معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ انسانیت کی قبریں کھودی جا رہی ہیں۔

یہ سازش ہے انسانیت کے خلاف، یہ سازش ہے اخلاق کے خلاف، یہ سازش ہے لقبول اقبال کے خلاف، یہ سازش ہے انسان کے مستقبل کے خلاف، بلکہ اب تو ڈر یہ ہے کہ انسان کے حال کے خلاف بھی سازش ہے، یہ وقف اس بری طرح ضائع ہو رہا ہے کہ دنیا کے ہر انسان کو اس پر آنسو بہانا چاہیئے اور ہر انسان کو نالشی بن جانا چاہیئے۔

اسلام کی عدالت قائم کیجیئے

اس وقف کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جا رہا ہے اس کے خلاف پوری بنی نوعِ انسان کو اور پورے افرادِ بشر کو مدعی ہونا چاہیئے، لیکن کس عدالت میں یہ مقدمہ دائر کیا جائے؟ کیا اقوام متحدہ کی عدالت میں یہ مقدمہ دائر ہو سکتا ہے؟ آپ کا ذاتی مقدمہ ابتدائی عدالتوں سے لے کر چیف جسٹس کی عدالت یا ہائی کورٹ میں جائیگا، سپریم کورٹ میں جائے گا، لیکن یہ انسانی کنبہ جس کے خلاف یہ عالمگیر سازش کی گئی ہے اور جسے خاک و خون میں ملایا جا رہا ہے، اس کے خلاف کس کی عدالت میں مقدمہ دائر کیا جائے؟ اور اس وقف کو کیسے بحال کیا جائے گا؟ قانون دانوں سے پوچھیئے، اور انسانیت کے بہی خواہوں سے پوچھیئے کہ کس عدالت میں یہ مقدمہ دائر کیا جائے، مشکل یہ ہے کہ مدعا علیہ ہی جج ہے، اس مقدمہ کا کیا حشر ہوگا جس کا جج خود مدعا علیہ ہے؟ اسی کے خلاف ہم مقدمہ دائر کرنا چاہتے ہیں اور اسی کی عدالت میں مقدمہ دائر کر رہے ہیں، اس مقدمہ کا کیا فیصلہ ہوگا؟ اس لئے اصل ضرورت یہ ہے کہ وہ عدالت قائم ہو جائے جہاں یہ مقدمہ دائر کیا جا سکے، وہ عدالت اس وقت دنیا میں موجود نہیں، وہ طاقت موجود نہیں جو اس مقدمہ کا فیصلہ کرے، اس میں دو صفتیں ہونی چاہیئں ایک صفت عدالت، ایک طاقت، اگر آپ کسی دانشور کے سامنے، کسی انسانیت کے بہی خواہ کے سامنے مقدمہ لے جائیں تو وہ اپنا فیصلہ تو صادر کر دے گا لیکن اس کو تنفیذ کے اختیارات نہیں، آج کوئی مسلمان ملک اس پوزیشن میں نہیں جو انسانیت کی دادرسی کر سکے، بلکہ اپنے ملک پر جو ظلم اور خطرہ درپیش ہے اس کو دور کر سکے، اس وقت المیہ یہ ہے پورے عالم انسانی کا کہ اس مقدس امانت میں جو ایک وقف کی حیثیت رکھتی تھی، خیانت کی

جاری ہے اور دنیا میں خیانت کی کوئی ایسی مثال کہیں نہیں ملتی، اس مقدس امانت میں خیانت کی جا رہی ہے، یہاں کی ہر چیز کو شیرِ مادر سمجھ لیا گیا ہے، جس کی لاٹھی اس کی بھینس اور جنگل کا قانون دنیا میں نافذ ہے، اس مقدس وقف کو جس کو خدا نے اہتمام کے ساتھ بنایا، قرآن مجید میں، صحف سماوی میں اس کا بار بار اللہ نے ذکر کیا ہے۔ اس کا ایک مرتبہ کہہ دینا کافی تھا لیکن تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ ہم نے زمین اس طرح بنائی پھیلائی، اس طرح زمین بچھائی، آسمان کا شامیانہ نصب کیا، سورج کو اس کے لئے قندیل بنایا اور چاند کو اس کے ٹھنڈک اور روشنی کا ذریعہ بنایا، کھیتیاں اگائیں، اس پر باغات لگائے، اس میں چشمے بنائے، یہ سب کیوں کیا جاتا ہے؟ تاکہ آپ کو اس وقف کی عظمت معلوم ہو، آپ کو اگر بتایا جائے کہ کسی کاغذ میں اندراج ہے کہ یہ وقف ایسے عظیم مقاصد کے لئے کیا جا رہا ہے اور اس وقف میں اس بات کی صلاحیت ہے، اس کا رقبہ اتنا بڑا ہے، اس میں اتنی عمارتیں موجود ہیں، اس میں ایک عظیم کتب خانہ ہے تو آپ کو اس کی اہمیت کا احساس ہوگا۔ خدا نے زمین کے بنانے کے سلسلے میں جو تفصیلات بیان کیں اس کا مقصد یہ ہے کہ ہم اس وقف کی عظمت اور اہمیت کو سمجھیں لیکن آج دنیا کا حال کیا ہے؟ یا تو کہیں صریح تخریب کا عمل جاری ہے، کہیں یہ حالت ہے کہ وسائل ہیں لیکن مقاصد نہیں، سب کیا جا سکتا ہے لیکن جن کے ہاتھ میں یہ وسائل ہیں وہ نہیں جانتے کہ ان کو کس طرح استعمال کریں؟ ان سے انسانیت کی فلاح میں کس طرح کام لیں؟ انسانیت کے دکھ درد کو ان سے دور کریں، انسان کو انسان سے ملائیں انسان کے دل سے عداوت اور کینے کا مادہ نکالیں اور محبت و اعتماد کو اس کی جگہ قائم کریں، انسان کو انسان کی مدد کے قابل بنائیں۔ ان کے پاس یہ مقاصد نہیں ہیں۔

مسیحیت اور یہودیت رہنمائی سے قاصر ہیں

یہ مقاصد صرف انبیاء علیہم السلام کے ذریعے حاصل ہو سکتے تھے اور سوائے اسلام کے ہر مذہب کا دامن ان سے خالی ہو چکا ہے اور مسیحیت کا دامن تو ایسا خالی ہوا کہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ خالی ہی نہیں بلکہ

اس نے اپنے دامن کو جھٹک دیا ہے اور اس میں جو کچھ تھا اس کو دور پھینک دیا ہے۔ مسیحیت آج اپنی قوموں کی جنھوں نے اس کو قبول کیا ہے اور اس کی حلقہ بگوش ہیں، رہنمائی سے بالکل قاصر ہے، مسیحیت ان کی رہنمائی کرے، ان کی بے اعتدالیوں پر کوئی قدغن لگائے اور زندگی کی مشکلات میں ان کی عقدہ کشائی کرے، اس سب سے عاجز ہے، اس لئے کہ موجودہ مسیحیت وہ مسیحیت نہیں ہے جو سیدنا عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کے ذریعہ پہنچی ہے، یہ سینٹ پال کی مسیحیت ہے جو یورپ میں آکر مسخ ہو گئی۔ یہودیت کا جہاں تک معاملہ ہے وہ اس سے پہلے بگڑ چکی تھی، وہ چند رسموں کا نام ہے، نسل پرستی کا نام ہے، وہ یعقوب علیہ السلام کی اولاد کے گرد گھومتی ہے۔ اس کو دنیا کی کسی نوع، خاندان، کنبے سے کوئی دلچسپی نہیں، بلکہ وہ اس پوری نسلِ انسانی کی تخریب ان کے اخلاق کو بگاڑنے کا منصوبہ رکھتی ہے۔ وہ صاف کہتے ہیں کہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم دنیا کی تمام قوموں میں بداخلاقی پھیلائیں، ان کی تمام اقدار کو، ان کی تمام بنیادوں کو متزلزل کردیں، ان میں اخلاقی انتشار، انارکی پیدا کریں، ان کو دماغی اعتبار سے، روحانی حیثیت سے، اخلاقی حیثیت سے دیوالیہ بنادیں تاکہ وہ ہمارے ہاتھوں شطرنج کے مہرے کی طرح کام کریں۔ ہم ساری دنیا کو اس طرح ذلیل کردیں اور قوموں کو اتنا کمزور کردیں کہ وہ ہمارے قدموں پر آکر گر جائیں، یہ یہودیت ہے۔

اب اسلام رہ جاتا ہے جو زندگی میں رہنمائی کر سکتا ہے، موجودہ دنیا کو اسلام کی اس لئے ضرورت ہے کہ اخلاق برباد ہو رہا ہے۔ انھوں نے کاش کہ دنیا کو یتیم خانہ ہی سمجھا ہوتا، یتیموں کی طرح قوموں کے ساتھ سلوک کرتے، اس کو یتیم خانہ نہیں قمار خانہ بنادیا ہے۔ ہم اس پوزیشن پر بہت خوش ہوتے کہ دنیا میں قوموں کو یتیم سمجھ لیا جاتا، یورپ اس پر راضی ہوتا کہ سب یتیم ہیں اور ساری دنیا ایک یتیم خانہ ہے۔ اسکے ساتھ ہمدردی، غمگساری ہونی چاہیئے۔ یہ بھی بہت غنیمت تھا۔

یہ دنیا شکارگاہ بنی ہوئی ہے

لیکن نہیں یتیم خانہ بھی نہیں، یہ دنیا شکارگاہ بنی ہوئی ہے۔ شکاری نکلتے ہیں ہتھیار لے کر اور قوموں

کا شکار کھیلتے چلے جاتے ہیں، قوموں کو پامال کرتے چلے جاتے ہیں، آج جو بڑی طاقتیں ہیں، ان کے نزدیک مشرقی اقوام کی قیمت، مسلم ممالک کی قیمت اتنی ہے کہ وہاں سے کچا مال (RAW METERIAL) ان کو ملے، پٹرول ان کو پہنچتا ہے، اور اگر کوئی جنگ ہو تو یہ ان کے ذریعہ سے اپنے دشمن کا مقابلہ کر سکیں، ان کو اپنا سپاہی بنا سکیں، یہ گویا ایندھن ہیں ان کے باورچی خانہ کا، بس اس کے سوا کوئی قیمت نہیں، آپ یقین مانئے ؎

مرے دیکھے ہوئے ہیں مشرق و مغرب کے میخانے

جس کو اب اہلِ مغرب "بلادِ نامیہ" (ترقی پذیر ممالک) کہنے لگے ہیں، ورنہ پہلے تو پسماندہ کہتے تھے۔ پسماندہ اقوام کی قیمت ان کے نزدیک یہ ہے کہ ایک اچھا ایندھن ہے جب آگ جلانا چاہیں، جب یہ اپنا مطبخ گرم کرنا چاہیں تو یہ قومیں اور یہ ملک ایندھن مہیا کریں، وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ قوموں کی تقدیر ہمارے ہاتھ میں آگئی ہے، انھوں نے انسانوں کے ساتھ جانوروں کا، بلکہ جمادات کا سلوک کر رکھا ہے اور آج کوئی طاقت نہیں جو اس کا مقابلہ کر سکے، سب اپنی طاقت اور اپنا جوہر کھو چکے ہیں، سب اپنا پیغام بھول چکے ہیں سب اپنا کردار چھوڑ چکے ہیں، سب میدان سے کنارہ کش ہو چکے ہیں۔

سارا انحصار اسلام اور مسلمانوں پر

اس وقت سارا انحصار مسلمانوں اور اسلام پر ہے۔ آپ حضرات کی بہت بڑی ذمہ داری ہے، آپ اس ملک کی فکر کریں، معاشرہ کی اصلاح کی فکر کریں، اس وقت مسلم معاشرہ ہر ملک میں مرض کی ایسی حالت میں پہنچ گیا ہے کہ اس کی جلد خبر لینے کی ضرورت ہے، معاشرہ کا عیب یہ نہیں کہ وہ فاسد الاخلاق ہو گیا ہے، خطرہ کی بات یہ ہے کہ معاشرہ فاسد المزاج ہو گیا ہے اور کسی معاشرہ کا فاسد الاخلاق ہونا اتنا خطرناک نہیں ہے، اسکے لئے سو تدبیریں ہیں لیکن معاشرہ جب فاسد المزاج ہو جائے تو پھر دوا بھی اثر نہیں کرتی، اس وقت اس معاشرہ کی خبر لینے کی ضرورت ہے۔ محکمۂ اوقاف اپنے وسائل کے ذریعہ اور ایک بہت بڑا وسیلہ جو اس کے

ہاتھ میں ہے وہ با اثر اور قابلِ احترام ائمۂ مساجد اور خطباء ہیں، یہ وہ ہیں جن کا عوام سے براہِ راست ربط ہے، اگر ہمارا محکمۂ اوقاف اِس کے لئے تیار ہو جائے اور وہ ائمہ وخطباء اپنی ذمہ داری سمجھیں اور بجائے اختلافی مسائل چھیڑنے کے جو اس ملک کا انتشار بڑھائیں گے اگر وہ معاشرہ کی اصلاح پر اپنی توجہ مرکوز کر دیں تو ملک کو بھی بچائیں گے اور عالمِ اسلام کی بہت بڑی خدمت کریں گے، آپ کو معلوم ہے جس وقت قسطنطنیہ محمد فاتح کی یلغار کے نیچے تھا، محمد فاتح کی فوجیں داخل ہو رہی تھیں، اس وقت اس پر بحث ہو رہی تھی کہ حضرت مسیحؑ نے جو روٹی کھائی تھی عشائے ربانی میں وہ فطیری تھی یا خمیری تھی، اس پر بڑی متکلمانہ بحثیں اور بڑی بڑی نکتہ سنجیاں ہو رہی تھیں اور محمد فاتح کی فاتح فوجیں یلغار کرتے ہوئے قسطنطنیہ میں داخل ہو رہی تھیں، مجھے اندیشہ ہے کہ یہاں بھی ایسے اختلافی مسائل نہ چھیڑے ہوں کہ فاتح تمدن کی یلغار جاری ہو، فاتح تہذیب کی یلغار جاری ہو، اس وقت صورتحال یہ ہے کہ مغربی تہذیب فاتحانہ پیش قدمی کر رہی ہے، ہماری اسلامی بنیادوں کو ہلا رہی ہے بلکہ ہماری چولیں اور ہمارے اس ملک کی چولیں بھی ہلا رہی ہے، اسلامی معاشرت تبدیل ہو رہی ہے، اسلامی تمدن دم توڑ رہا ہے، مسلمان ذہنی وفکری ارتداد کے شکار ہو رہے ہیں اور ہمارے یہاں علمِ غیب کی بحثیں ہو رہی ہیں، بشریتِ رسول کی بحثیں ہو رہی ہیں، توقع نہیں کہ اس نازک دور میں جبکہ ہمارے سروں پر خطرے کی تلوار لٹک رہی ہے، کوئی یہ بحثیں چھیڑے گا، لیکن اس دنیا میں سب کچھ ممکن ہے، ہو سکتا ہے ہم اپنی ذہانت ان فروعی اور نزاعی معاملوں میں ضائع کر رہے ہوں اور اپنی توانائی و طاقت اس میں برباد کر رہے ہوں، آپ سے یہ کہتا ہوں کہ آپ خطرے کو محسوس کریں، آپ کا ملک ایک دوراہے پر کھڑا ہے، اس موقع پر آپ متاعِ اسلام کو بچانے کی کوشش کریں، جب یہ بچ جائے گی تو پھر ان مسائل کا موقع ہوگا۔ یہ بحثیں مدرسہ کے اندر کی ہیں، یہ بحثیں مدرسوں کے باہر کی نہیں، یہ میں نے ابھی ایک بڑی کانفرنس میں جو خاص مسلک رکھنے والی جماعت نے ہندوستان کے ایک مقام پر کی تھی خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ اختلافات ہمیشہ سے تھے۔ نماز کے اندر بھی مذاہبِ اربعہ میں اور مذاہبِ اربعہ کے باہر بھی کتنے اختلاف ہیں کہ ان کو گنا جائے تو درجنوں کی تعداد میں نکلیں لیکن کبھی ان سے انتشار نہیں پیدا ہوا۔ انتشار اس وقت ہوا جب معلمین و مدرسین

مدرسہ سے نکل کر عوام میں آگئے، غلطی یہ ہے کہ ان مسائل کا فیصلہ چوراہوں پر کیا جائے، مسئلوں کا فیصلہ جلسہ عام میں کیا جائے، ان مسئلوں کو نعرہ بنایا جائے، ان مسئلوں کو عوام کے حوالے کر دیا جائے، کہ اس سے بجائے ایک دوسرے سے ملنے کے وہ جدا ہوں، ورنہ یہ بحثیں تو ہمیشہ ہوتی رہی ہیں، ان سے علم میں اضافہ ہوا، ذہانت میں اضافہ ہوا اور یہ تو زندہ انسان و زندہ جماعت کی خصوصیت ہے کہ غور کرے، سمجھنے کی کوشش کرے، اس پر کوئی پہرے نہیں بٹھا سکتا، اور اگر یہ بحثیں عوام میں آجائیں اور ان سے سیاسی مقاصد حاصل کئے جائیں، جماعتی مقاصد حاصل کئے جائیں، ان سے اپنی بڑائی اور ذاتی مفادات کی حفاظت کا کام لیا جائے تو پھر یہ مفر ہی نہیں مہلک بن جاتی ہیں۔ یہ مسئلے فقہی ہیں، خالص علمی ہیں، کلامی ہیں، ان کو اپنے کتب خانوں میں رکھیئے، مدرسوں میں رکھیئے، دوستوں کے حلقوں میں رکھیئے، طالبِ علموں کے سامنے رکھیئے، ان کو عوام میں نہ لائیے، جو ہمارے معاشرہ میں مزید انتشار پیدا کرے اور مسلمان کو مسلمان سے الگ کرے اور مسلمان کو مسلمان سے توڑے اس کی کوئی گنجائش نہیں۔

مولانا رومؒ نے تو بہت معمولی سی بات پر کہا ہوگا ؎

تو برائے وصل کردن آمدی

نے برائے فصل کردن آمدی

آپ کو جو مسائل درپیش ہیں وہ قوموں اور ملکوں کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے والے ہیں، اس سے ہم کو بڑی احتیاط برتنی چاہیئے۔ علمی بحثوں کا کوئی دروازہ بند نہیں کر سکتا، میں تو ہرگز اس کی رائے نہیں دوں گا، اس لئے کہ میں طالبِ علم ہوں لیکن ان کو سیاسی تفریق، جماعتی تفریق کے لئے، جماعتی مقاصد سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے اور محض جاہ طلبی کے لئے اور اپنی بات اونچی کرنے کے لئے استعمال نہیں کرنا چاہیئے، اس وقت ہمیں پورے اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے عہد کر کے معاشرہ کی اصلاح کے کام میں لگ جانا چاہیئے اور ملک کو اس تہذیبی و تمدنی ارتداد سے بچانا چاہیئے۔

یہ محکمۂ اوقاف جس کے دفتر میں ہم آج جمع ہیں، اس سلسلہ میں اہم کردار بلکہ فیصلہ کن کردار ادا کر سکتا ہے، اس لئے کہ ابھی تک خدا کے فضل سے عوام پر علماء کا اثر ہے، ائمہ کا اثر ہے، مساجد کا احترام ہے، منبرِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مسجد کے محراب و منبر سے جو آواز بلند ہو گی دلوں کی گہرائی تک پہنچ جائے گی، وہاں ہمارے سیاسی لیڈر اور ہمارے منتظمین کی آواز نہیں پہنچ سکتی جہاں ان واعظین کی، خطیبوں کی اور علماءِ کرام کی آواز پہنچے گی، اسلئے اس آواز کے بارے میں اللہ سے ڈرنا چاہیئے اور اس اثر کو بڑی احتیاط کے ساتھ استعمال کرنا چاہیئے۔

ان الفاظ کے ساتھ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ مجھے آپ نے اتنے قابلِ قدر، قابلِ احترام علماء، خطباء، ائمۂ مساجد اور ایسے مخلص مسلمانوں کے سامنے اپنے خیالات پیش کرنے کا موقع دیا۔

مُسلم ممالک کا تعلیمی نظام اور تعلیمی مسائل

(دورۂ پاکستان کی وہ تقریریں جو وہاں کی جامعات اور تعلیمی اداروں میں کی گئیں)

عالمِ اسلام میں اعلیٰ تعلیم کا مقصد و منہاج

یہ تقریر ۱۲ر جولائی ۷۸ء کو کراچی یونیورسٹی میں ہوئی، جلسہ میں یونیورسٹی کے اسٹاف اور طلبہ کے علاوہ ممتاز دینی، علمی، ادبی شخصیتیں، سیاسی رہنما، دینی اداروں کے ذمہ دار علماء اور ادب و صحافت سے تعلق رکھنے والے معروف اصحاب شریک تھے۔

کراچی یونیورسٹی کے آرٹس آڈیٹوریم کی وسعت کو سامعین کی کثرت نے ناکافی ثابت کر دیا تھا۔ بڑی تعداد کو گیلری میں کھڑے ہو کر تقریر سننی پڑی۔

استقبالیہ اور تعارفی کلمات ڈاکٹر احسان رشید صاحب وائس چانسلر اور اختتامی کلمات تشکر اسماعیل سعد صاحب رجسٹرار کراچی یونیورسٹی نے ادا کئے۔

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الامین

علم ایک صداقت ہے

جناب وائس چانسلر صاحب، اساتذۂ جامعہ، طلبہ و طالبات اور برادران عزیز! اگرچہ میں علم میں تقسیم کا قائل نہیں ہوں۔۔ اور میرا عقیدہ ہے کہ علم ایک اکائی ہے جو بٹ نہیں سکتی، اس کو قدیم و جدید، مشرقی و مغربی، نظری اور عملی میں تقسیم کرنا صحیح نہیں ــــ اور جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا ہے کہ ؏

حدیث کم نظراں قصۂ قدیم و جدید

میں علم کی دینی اور دنیوی تقسیم کا بھی قائل نہیں ہوں۔ میں علم کو ایک صداقت مانتا ہوں یا ایک انسانی تجربہ جو کسی ملک و قوم کی مِلک نہیں اور نہ ہونی چاہیئے، میں زندگی کے دوسرے سرچشموں کی بھی جغرافیائی نسلی، تاریخی یا سیاسی حد بندیوں کا قائل نہیں، میں علم کو ایک "وحدت" مانتا ہوں اور جس کو کثرت کہا جاتا ہے اس کثرت میں بھی مجھے وحدت نظر آتی ہے، علم کی وہ وحدت سچائی ہے، سچ کی تلاش ہے، علمی ذوق ہے اور اس کو پانے کی خوشی ہے، اس کے باوجود میں جناب وائس چانسلر صاحب کا اور اس جامعہ کے ذمہ داروں کا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے آج ان عزیز طالب علموں اور چمن اسلام کے ان شگوفوں کو خطاب کرنے کے لئے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا ہے جس کا (صحیح یا غلط طریقہ پر حقیقتاً یا شہرت کی بنا پر) انتساب اور تعلق قدیم طرز تعلیم سے ہے، اس لئے میں وائس چانسلر صاحب کی وسیع النظری اور آپ کے جامعہ کی اس فراخ دامانی کا معترف ہوں کہ اس نے اس میں کوئی تفریق نہیں کی، میں علم، ادب، شاعری فلسفہ، حکمت، کسی میں اس اصول کا قائل نہیں ہوں کہ جو اس کی "وردی" پہن کر آئے وہی "عالم" اور "دانشور" ہے، اور یہ مان لیا گیا ہے کہ جس کے جسم پر وردی نہ ہو وہ نہ مستحق خطاب ہے نہ لائق سماعت، بدقسمتی سے ادب و شاعری میں بھی یہی حال ہے کہ جو ادب کی دوکان نہ لگائے اور اس پر ادب کا سائن بورڈ آویزاں نہ کرے اور ادب کی وردی پہن کر کے مشاعرے میں یا کسی ادبی محفل میں نہ آئے وہ "بے ادبی" کا مرتکب ہے۔ لوگوں نے ان پیدائشی ادیبوں اور شاعروں کا قصور بھی معاف نہیں کیا ہے جن کے جسم پر وہ وردی دکھائی نہیں دیتی ہو یا جن کو بدقسمتی سے ان وردیوں کے گودام سے کوئی وردی نہ مِل سکی ہو، اگرچہ میں علم کی آفاقیت اور علم کی تازگی کا قائل ہوں، جس میں خدا کی رہنمائی ہر دور میں شامل رہی ہے، اگر خلوص ہے اور سچی طلب ہے، تو خدا کی طرف سے فیضان میں کمی نہیں، بہرحال یہ ایک جرأت مندانہ قدم ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس کی تقلید کی جائے۔ ہماری قدیم درسگاہوں میں جدید ماہرین کو دعوت دی جائے اور ہماری ان جامعات اور دانشگاہوں میں ان لوگوں کو یاد کیا جائے جنھوں نے خلوص کے ساتھ پڑھا ہے اور انسانوں کے

پیدا کئے ہوئے علمی اور ادبی ذخیرے سے فائدہ اٹھایا ہے۔

تعلیم کا اصل مقصد

حضرات میں شکر گذار ہوں کہ مجھے اس باوقار دانشگاہ میں ایک ایسے مجمع کے سامنے اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا جا رہا ہے جو کل اسی ملک کی نہیں بلکہ شاید دوسرے اسلامی ملکوں میں بھی کوئی اہم کردار ادا کر سکیں یا جن کے ہاتھ میں زمامِ کار آئے، کم از کم تعلیم و تربیت کی رہنمائی اور سربراہی کا ان کو موقع ملے۔

میں نے تعلیم کی غرض و غایت اور اس کے فائدے و نتیجہ کے بارے میں بہت کچھ پڑھا ہے لیکن میں یہاں صرف ایک حوالہ دوں گا۔

مشہور برطانوی ماہر تعلیم (SIR PERCY NEINN) نے تعلیم کی بڑی جامع و بلیغ تعریف کی ہے وہ کہتے ہیں کہ

> "تعلیم کا بنیادی خیال جو پورے نظام تعلیم پر حاوی ہونا چاہیئے یہ ہے کہ تعلیم اس کوشش کا نام ہے جو بچوں کے والدین اور سرپرست اس نظریۂ حیات پر (جس پر وہ عقیدہ رکھتے ہیں) اپنی نئی نسل کو تیار کرنے کے لئے کرتے ہیں "مدرسہ" کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ان روحانی طاقتوں کو جو اس نظریۂ حیات سے وابستہ ہیں طالب پر اثر ڈالنے کا موقع دے اور وہ طالب علم کو ایسی تربیت دے جو اس قوم کی زندگی کے تسلسل و ترقی میں طالب علم کی دستگیری کرے اور اس کے ذریعہ وہ مستقبل کی طرف اپنا سفر جاری رکھ سکے"[1]

میں نے تعلیم کی تعریف کے سلسلہ میں جو کوششیں دیکھی ہیں اور جو عبارتیں میری نظر سے گزری ہیں ان میں میرے نزدیک یہ سب سے زیادہ جامع اور عملی تعریف ہے۔ تعلیم کیوں دی جاتی ہے؟ اور تعلیم پر اعلیٰ صلاحیتیں

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا آرٹیکل ایجوکیشن (EDUCATION)

اور قوم کی کمائیاں فیاضی کے ساتھ اور ایسے منظم طریقے پر کیوں صرف کی جاتی ہیں؟ کیا اس لئے کہ وہ تعلیم ایک خلیج پیدا کردے اس قوم کے معتقدات، مقاصد اور علمی و تہذیبی سرمایہ اور ان چیزوں کے درمیان جو اس کو عزیز ہیں، جو خیالات اس کو عزیز ہیں، اور عزیز ہونے کے لئے شرط نہیں ہے، جو چیز جس کو عزیز ہو، یہاں یہ بحث نہیں اٹھائی جاسکتی کہ وہ چیزیں عزیز بنانے کے قابل ہیں یا نہیں، لیکن جو چیزیں اسکو عزیز ہیں، جو عقائد اس کو عزیز ہیں، جو خیالات اس کو عزیز ہیں، جو اقدار جو ویلیوز (VALUES) اور جو تصورات و معتقدات (CONCEPTIONS) اور جو افکار (IDIAS) اس کو عزیز ہیں، جو ذخیرہ اس کو اپنے اسلاف سے ملا ہے، تعلیم کا اصل فرض یہ ہے کہ وہ ان دونوں کے درمیان کوئی رشتہ پیدا کرے اور قوم کی نئی نسل کی طرف اس ذخیرہ کو منتقل کرے جو اس قوم کو عزیز ہے اور جس پر اس کے اسلاف کی بہترین طاقتیں اور طویل ترین مدت صرف ہوئی ہے اور جن کے لئے بعض اوقات وہ قوم نبرد آزما ہوئی اور اس نے اپنی جان کی، اپنی عزت کی، آبرو کی، بازی لگادی ہے، یہاں یہ بحث بڑی بے موقع اور بڑی غیر ہمدردانہ بحث ہے کہ ان قوموں نے ان اقدار کے لئے کیوں جنگ کی، تعلیم یہ سرمایہ نہ صرف منتقل کرے اور طوطے کی طرح اس کو رٹا دے بلکہ اس کو اس کے قلب و دماغ میں جاگزیں کردے، اس کا ذہن، اس کا ذوق اس کو قبول کرلے اور جذب کرلے، وہ اس کے لئے خارجی اور اجنبی چیز نہ ہو بلکہ وہ اس کے لئے ایک داخلی چیز بن جائے اور یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس کا مزاج بن جائے۔

خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

میں سمجھتا ہوں کہ یہ تعریف بہت جامع ہے لیکن جب ایسی ملت کا معاملہ ہو کہ وہ عقائد اور وہ اقدار اس کے اپنے بنائے ہوئے اور پیدا کئے ہوئے نہ ہوں بلکہ ان کا سرچشمہ وحی الٰہی ہو، ان کا سرچشمہ کلام الٰہی ہو، ان کا سرچشمہ نبوت ہو، ان کا سرچشمہ وہ علم غیب ہو اور وہ علم ازلی ہو جس میں کوئی تغیر نہیں ہوتا،

تب ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے۔ اب اگر کوئی نظامِ تعلیم یہ خدمت انجام دیتا ہے، شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر، ارادی طریقے پر یا غیر ارادی طریقے پر، غفلت کی بنا پر، یا کسی بڑی سازش کے ماتحت، وہ سازش اس ملک کے اندر ہوئی ہو یا اس ملک کے باہر ہوئی ہو کہ اس نظامِ تعلیم کے ساختہ پرداختہ حضرات کا عقیدہ ان تمام عقائد اور اقدار سے اٹھ جائے یا متزلزل ہو جائے، اس کی چولیں ہل جائیں اور وہ دائمی شک میں، تردد میں مبتلا ہو جائیں، وہ ایک ذہنی کشمکش (MENTAL CONFLICT) میں مبتلا ہو جائیں اور انفرادی زندگی کی حد تک نہیں بلکہ یہ کشمکش (CONFLICT) افراد کی حدود سے تجاوز کر کے اسی ملت کے میدانِ زندگی میں کارفرما ہو، وہ اس کو متاثر کر رہی ہو اور ایک بڑی خونریز کشمکش، ایک بڑی خونریز جنگ برپا ہو جائے اس تعلیم یافتہ نسل کے درمیان اور ان اقدار کے درمیان، ان مفاہیم کے درمیان اور ان عقائد کے اور خیالات کے درمیان، میں اسلام کو ایک ترکے (LEGACY) کی حیثیت سے نہیں مانتا اور اس کو اسلام کی بڑی تعریف نہیں سمجھتا اس لئے میں LEGACY OF ISLAM اور HERITAGE OF ISLAM پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کا زیادہ قائل نہیں ہوں، میں اسلام کو ایک پیغامِ حیات سمجھتا ہوں، میں اسلام کو زمانہ کے ساتھ چلنے والا نہیں بلکہ زمانہ سے آگے چلنے والا، زمانہ کا رہبر، زمانہ کا رفیق اور شریکِ کارواں ہی نہیں بلکہ اس کا محتسب اور اتالیق (GAURDIAN) سمجھتا ہوں، اس لئے جب غیر ارادی طریقے پر یا اتفاقاً یا کسی سازش کے ماتحت کوئی اعلیٰ تعلیم یافتہ یہ نتیجہ پیدا کرے کہ اس کی نسل ان تمام اقدار کے بارے میں، ان تمام عقائد و خیالات کے بارے میں شک میں مبتلا ہو جائے، اس کا یقین اس سے اٹھ جائے اور وہ ان کو ایک طفل تسلی یا ڈھکوسلا سمجھنے لگے یا کم سے کم اس کو ان اقدار پر اس طرح یقین نہ ہو کہ وہ ان کی حمایت کرے، سینہ سپر ہو، ان کے لئے کبھی نبرد آزما ہو جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ تعلیم صرف انتشار کا باعث ہے۔

اسلامی ملک کا معاملہ زیادہ اہم ہے

جب میں یہاں آپ کے سامنے خطاب کر رہا ہوں تو میرے سامنے تمام اسلامی ممالک ہیں، میرے

سامنے ترکی ہے ، میرے سامنے مصر و شام و عراق ہیں اور میرے سامنے مملکت سعودیہ عربیہ بھی ہے جہاں ابھی چند ماہ پہلے ایک آل ورلڈ اسلامک ایجوکیشن کانفرنس (ALLWORLD ISLAMIC EDUCATION CONFERENCE) ہوئی تھی جس میں یہاں سے احسان رشید صاحب اور ڈاکٹر بروہی صاحب بھی گئے تھے ، میں ہندوستان کی طرف سے آیا تھا ۔ وہاں میں نے جو پیپر (PAPER) پڑھا تھا ، اس میں میں نے اس چیز کا اظہار کیا تھا کہ معاملہ کہیں زیادہ سنگین اور نازک ہو جاتا ہے جب کسی اسلامی ملک کا معاملہ ہو ، اسلامی ملک میں وہ مسلمان آبادی ہے جو اپنی ایک شخصیت رکھتی ہے ، ایک (PERSONALITY) رکھتی ہے ، اس کی ایک ملی شخصیت ہوتی ہے ، اس کے پاس ایک پیغام ہے ، اس کو دنیا میں ایک فرض انجام دینا ہے ، اگر تعلیم وہاں اس نسل میں انتشار پیدا کر دیتی ہے اور صرف یہ خدمت انجام دیتی ہے کہ وہ نسل جب کسی جدید دانشگاہ سے پڑھ کر نکلتی ہے تو وہ اپنے معتقدات سے بیگانہ بن جاتی ہے ۔ وہ ایک نئی قوم بن جاتی ہے جو کسی طریقے سے اس ملک میں فِٹ نہیں ہو سکتی اور وہاں کے لئے وہ ایک اجنبی عنصر بن جاتی ہے ، اس سے ایک نئی پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے ، وہاں کی زندگی میں ایک نیا مسئلہ (PROBLEM) وجود میں آجاتا ہے ، ایک نئی گرہ وہاں کے رشتہ حیات میں پڑ جاتی ہے ، وہ ملک یا وہ ملت جس کے معتقدات اور جس کے اقدار حیات اور نقطۂ فکر کی بنیاد وحی الٰہی پر ہے ، اگر وہاں کی تعلیم کا ثمرہ اور نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ ایک ذہنی انتشار ، ایک خونریز جنگ اور ایک زبردست کشمکش اس نئی نسل کے درمیان اور اس کے خاندانوں کے درمیان ، اس معاشرہ کے درمیان جس کا اس سے تعلق ہے ، ان نونہالوں اور نوجوانوں کے درمیان ، اس کی پوری تاریخ اور پورے کارنامہ ، اس کے منصب و مقام کے درمیان جو خدا نے اس کو عطا کیا ہے اور مسلمان کا پیغام اور اس کے انجام دینے کا جو کام ہے ، اس کے درمیان ایک کشمکش پیدا ہو جاتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی خدمت نہیں ہے ، SERVICE نہیں ہے ...... بلکہ بدخدمتی (DISSERVICE) ہے ۔

کسی اسلامی ملک کی جامعہ کا اولین فریضہ

آپ مجھے معاف کریں، میرا اشارہ کسی خاص جامعہ کی طرف اور کسی خاص جامعہ کے ذمہ داروں کی طرف نہیں ہے، میں بالکل اصولی حیثیت سے گفتگو کر رہا ہوں کہ ایک جامعہ جو کسی اسلامی ملک میں قائم ہو، اس کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ ان اقدار اور عقائد و خیالات پر، اس تہذیب پر، اس پیغام پنہاں امتیازات و تشخصات پر یقین پیدا کرے جس کی وہ قوم حامل ہے اور وہ یقین محض عامیانہ یقین نہ ہو، ایک ایسے لے مین (LAYMAN) کا یقین نہ ہو، ایک راستہ چلنے والے آدمی (MAN OF STREET) کا یقین نہ ہو، بلکہ ایک پڑھے لکھے انسان کا، ایک اسکالر کا یقین ہو، جس کا دل جتنا مطمئن ہو، اسی درجہ اس کا دماغ بھی مطمئن ہو، یہ نہیں کہ ع

"قلب او مومن دماغش کافر است"

جیسا کہ اقبال نے ایک مغربی فلسفی کے متعلق کہا، جس طرح فرد اور جماعت کے درمیان کشمکش جائز نہیں، اسی طرح فرد کی زندگی میں فرد کے قلب و دماغ کے درمیان بھی کشمکش درست نہیں اور نہ اس کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ یہ کشمکش اگر کوئی جامعہ یا جامعہ کا نصاب یا جامعہ کا کوئی طریقۂ کار اور نظام پیدا کرتا ہے تو یہ کشمکش اس ملک کے لئے خوش قسمتی نہیں بلکہ بد قسمتی ہے

قلب اور دماغ دونوں کا اطمینان ضروری ہے

آپ نے مجھے موضوع دیا ہے کہ اسلامی جامعات کا مقصد و منہاج کیا ہونا چاہیئے؟ میں سمجھتا ہوں کہ ان کا سب سے بڑا مقصد و منہاج یہ ہے کہ وہ ان چیزوں پر یقین پیدا کرے، وہ یقین جو علم اور مطالعہ کے راستہ سے ہوتا ہے، وجدان کے راستہ سے ہوتا ہے، دماغ کے سکون کے راستہ سے ہوتا ہے،

تقابلی مطالعہ کے راستے سے ہوتا ہے۔ اگر یہ یقین کسی شخص کو قلبی طور پر حاصل ہو جاتا ہے لیکن اس کا دماغ اس سے مطمئن نہیں ہوتا، وہ اپنے دماغ کو بہلاتا رہتا ہے، پھسلاتا رہتا ہے وہ اپنے دماغ کو بیدار نہیں ہونے دیتا، جس طرح بعض غیر مسلم ملتوں کا حال ہے کہ وہ اپنے مذہب کی بقا اور اپنے مذہب کی ترقی اس میں سمجھتی ہیں کہ علم کا شعور جاگنے نہ پائے، اس مذہب کے حاملین یا اس مذہب کے حلقہ بگوشوں کا شعور جاگنے نہ پائے، وہ اپنے شعور کی زندگی و بیداری میں اپنے مذہب کی موت سمجھتے ہیں، اس لئے کلیسا اور علم (CHURCH & SCIENCE) میں وہ کشمکش پیش آئی جس کی خونریز کہانی اور دلدوز کہانی ڈریپر کی مشہور کتاب CONFLICT BETWEEN RELIGONS & SCIENCE میں آپ پڑھتے ہیں۔ یہ کشمکش اس لئے پیدا ہوئی کہ کلیسا کی بنیاد اس پر تھی کہ انسانی شعور جتنا سوتا رہے اچھا ہے، اسے لوریاں دے کر اور سلانا چاہیئے، اور انسان کا علم جتنا محدود رہے اچھا ہے بلکہ بہتر یہ ہے کہ وہ علم سے بالکل عاری اور محروم ہو۔ اس وقت تک مسیحیت کی زندگی ہے، اسی وقت تک بائیبل پر ایمان راسخ ہوگا۔ عہد عتیق کی کتابیں بعض ایسی باتیں پیش کرتی ہیں کہ جن کی علم جدید تصدیق نہیں کرتا بلکہ اس کی نفی کرتا ہے، اس لئے کلیسا اپنی خیریت اسی میں سمجھتا تھا کہ مسیحی کا شعور بیدار نہ ہونے پائے اور علوم ترقی نہ کریں، اس لئے وہ علم کی راہ روک کر کھڑا ہو گیا، علم کے لئے وہ سنگ راہ ثابت ہوا بلکہ اہل کلیسا نے علم کو اپنا مد مقابل اور حریف سمجھ لیا، نتیجہ یہ نکلا کہ علم تو انسان کی فطرت کا ایک تقاضا تھا علم تو انسان کے اندر کا ایک جذبہ تھا، علم تو خدا کی ایک نعمت تھی، علم تو دنیا کی ایک ضرورت تھی، علم تو خدا نے پھلنے پھولنے اور بڑھنے کے لئے پیدا کیا تھا، مٹنے اور مرجھانے کے لئے نہیں پیدا کیا تھا، مذاقتیں مٹ نہیں سکتیں، نتیجہ یہ ہوا کہ کلیسا کو علوم کے مقابلہ میں اور لوگوں کے طلب علم اور شوق جستجو (CURIOCITY) کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے، یہ وہ منحوس واقعہ تھا جو اگرچہ مسیحی یورپ میں پیش آیا لیکن اس کا اثر تقریباً تمام دنیا اور تمام مذاہب پر پڑا اور بہت سے لوگوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ علم و عقل اور علم و مذہب

کی ترقی ساتھ نہیں چل سکتی، تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے مجھے افسوس کے ساتھ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ تھوڑے وقفے کے لئے بعض اسلامی ملکوں میں بھی یہ غلط خیال پیدا ہوا، لیکن اسلام چونکہ اس سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا، اسلام کی روح اس کی منکر اور اس سے باغی ہے اس لئے یہ چیز زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکی اور یہ مصنوعی کشمکش عالم اسلام میں قائم نہ رہ سکی۔ مسیحی یورپ کے اثر سے پیدا تو ہوئی لیکن بہت جلد مغربی ممالک کا یہ سایہ دور ہو گیا۔

علم کی قسمت قلم سے وابستہ

میں یہ سمجھتا ہوں کہ اسلامی یونیورسٹیوں اور ان اسلامی جامعات کا ایک فرض تو یہ ہے کہ علم و دین میں یہ خلیج پیدا نہ ہونے پائے جو مسیحی یورپ میں یا ان مذاہب میں جن کا علم و عقل کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں تھا بلکہ وہ علم و عقل کے بیچ کر اور کتر اکر اور بلکہ اس کی آنکھوں میں دھول ڈال کر پیدا ہوئے اور اسی حالت میں وہ پھلے پھولے، وہاں تو اس بات کی گنجائش ہو سکتی ہے، لیکن جس نے سب سے پہلے اپنے دین کا اور اپنی دعوت کا اور اپنے علم کا اعلان اس طرح کیا کہ

اقرأ باسم ربك الذی خلق	(اے محمد) اپنے پروردگار کا نام لیکر پڑھو جس نے پیدا
خلق الانسان من علق اقرأ	کیا جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا پڑھو
وربك الاکرم الذی علم بالقلم	اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ
علم الانسان ما لم یعلم	علم سکھایا اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کا
	اس کو علم نہ تھا۔

جس نے اپنی وحی کی پہلی قسط میں اور اس باران رحمت کے پہلے چھینٹے میں بھی اس قلم کو، اس حقیر قلم کو فراموش نہیں کیا، جس نے اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا کہ علم کی قسمت قلم سے وابستہ ہے۔ غار حرا کی اس تنہائی میں جہاں

ایک نبی اُمّی اللہ کی طرف سے دنیا کی ہدایت کے لئے پیغام لینے گیا تھا اور جس کا یہ حال تھا کہ اس نے قلم کو حرکت دینا خود نہیں سیکھا تھا، جو قلم کے فن سے واقف نہیں تھا، آپ خیال کیجیے کیا دنیا میں، دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر کہیں مل سکتی ہے اور اس بلندی کا تصور ہو سکتا ہے کہ نبی اُمّی پر، ایک امت اُمّی کے درمیان ایک ایسے ملک کے درمیان کہ جہاں علم کا ہنر عام نہیں تھا، جامعات اور دانش گاہیں درسگاہیں تو بڑی چیز ہیں۔ جہاں حرف شناسی بھی نہیں تھی وہاں اس نبی پر وحی نازل ہوتی ہے اور پہلی بار وحی نازل ہوتی ہے اور آسمان و زمین کا رابطہ صدیوں کے بعد قائم ہوتا ہے، اس کی ابتدا "اُعْبُدْ" سے نہیں، اس کی ابتدا "صَلِّ" سے نہیں بلکہ اس کی ابتدا ہوتی ہے "اقرأ" سے جو خود پڑھا ہوا نہ تھا اس پر جو وحی نازل ہوتی ہے اس میں اس کو خطاب کیا جاتا ہے کہ "اقرأ" اس لئے کہ تمھیں جو امت دی جانے والی ہے وہ امت صرف علم کی بھی طالب نہ ہوگی بلکہ وہ علم آموز ہوگی، وہ علم کی اس دنیا میں اشاعت کرنے والی ہوگی، جو دور تمھیں دیا جاتا ہے اصلاح اور ہدایت کا، جو دور تمھارے حصّے میں آیا ہے وہ دورِ اُمیت کا دور نہیں ہوگا، وہ دَورِ وحشت کا دور نہیں ہوگا، وہ دورِ جہالت کا دور نہیں ہوگا، وہ دورِ علم دشمنی کا دور نہیں ہوگا، وہ دورِ تخریب کا دور نہیں ہوگا، وہ دورِ علم کا دور ہوگا، عقل کا دور ہوگا، حکمت کا دور ہوگا، تعمیر کا دور ہوگا، انسان دوستی کا دور ہوگا، وہ دورِ ترقی کا دور ہوگا۔ اس لئے پہلی بار دنیا میں، مذاہب کی تاریخ میں پہلا تجربہ تھا (اگر اس کو تجربہ کہنا صحیح ہو) کہ اس نبی اُمّی پر ایک اُمّی قوم کے درمیان جو وحی نازل ہوئی ہے اس کی ابتدا ہوتی ہے "اقرأ" (پڑھو) ہے باسم ربك الذی خلق۔ بڑی غلطی یہ تھی کہ علم کا رشتہ رب سے ٹوٹ گیا تھا، اس لئے علم سیدھے راستے سے ہٹ گیا تھا، اس لئے اس ٹوٹے ہوئے رشتہ کو یہاں جوڑا گیا۔ جب علم کو یاد کیا گیا، علم کو یہ عزت بخشی گئی تو اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی متنبہ کیا گیا کہ اس علم کی ابتدا اسمِ رَب سے ہونی چاہیئے، اس لئے کہ یہ علم اس کا دیا ہوا ہے اس کا پیدا کیا ہوا ہے اور اس کی رہنمائی میں یہ متوازن ترقی کر سکتا ہے۔ یہ جو جملے میں سنا رہا ہوں یہ دنیا کی سب سے بڑی انقلاب آفریں، انقلاب انگیز

اور صاعقہ آسا آواز ہے، جو ہماری دنیا کے کانوں نے سنی تھی جس کا کوئی تصور نہیں کر سکتا تھا۔ اگر دنیا کے ادیبوں اور دانشوروں کو یہ دعوت دی جاتی کہ آپ لوگ قیاس کیجئے اور یہ بتائیے کہ جو وحی نازل ہونے والی ہے، اس کی ابتدا کس چیز سے ہو گی؟ اس میں کس چیز کو اولیت دی جائے گی؟ تو میں سمجھتا ہوں کہ ان میں سے ایک آدمی بھی جو اس اُمّی قوم اور اس کے مزاج اور دماغ سے واقف تھا، وہ سب کچھ کہہ سکتا تھا لیکن یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ جو پہلی وحی نازل ہو گی وہ "اقرأ" کے لفظ سے شروع ہو گی۔ "پڑھو" "اقرأ" قرأت کا لفظ ہے، یہاں خالص علم کا بھی لفظ نہیں ہے، یعنی اس کا تعلق کاغذ سے بھی ہے، اس کا تعلق نقوش سے بھی ہے اور اس کا تعلق قلم سے بھی ہے، وہ علم نہیں جو لدنی طریقہ پر آتا ہے بلکہ وہ علم جو قلم کے ساتھ ہے، کاغذ کے ساتھ ہے، صحیفوں کے ساتھ ہے، کتب خانوں کے ساتھ ہے، تجربوں کے ساتھ ہے، ذہانتوں کے ساتھ ہے، "اقرأ باسم ربك الذی خلق"۔

یہ دین علم سے الگ نہیں ہو سکتا

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس دین کا مزاج بتا دیا گیا کہ یہ دین کبھی علم سے الگ نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ سب سے پہلے جو پیغام دیا گیا اس میں خود کہا گیا کہ "پڑھو" تو مسلمان بے پڑھے کیسے رہ سکتے ہیں۔ وہ مسلمان حقیقی مسلمان نہیں جو علم سے اپنا رشتہ توڑ لے وہ اسلام کا صحیح نمائندہ ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ پہلی بات تو یہ انقلاب انگیز دعوت کہ "اقرأ" پڑھو باسم ربك الذی خلق اپنے رب کے نام سے پڑھو، اس کی رہنمائی میں یہ سفر شروع کرو، اس لئے کہ یہ سفر بہت طویل ہے، بہت پر پیچ ہے، پر خطر ہے، قدم قدم پر قافلے لوٹنے والے ہیں، قدم قدم پر بڑی بڑی کھائیاں ہیں۔ قدم قدم پر گہرے دریا ہیں، قدم قدم پر سمندر ہیں، قدم قدم پر سانپ اور بچھو ہیں، اس لئے اس میں ایک رہبر کامل رفاقت ہونی چاہیئے اور وہ رہبر کامل حقیقتاً خدا کی ذات ہے، اس لئے اقرأ باسم ربك الذی خلق

پڑھو لیکن وہ مجرد علم نہیں، وہ علم نہیں جو بیل بوٹے بنانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو محض کھلونوں کا نام ہے، وہ علم نہیں جو محض دل بہلانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو ایک کو دوسرے سے لڑانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو قوموں کو قوموں سے ٹکرانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو اپنے معدہ کے رقبہ کو بھرنے کا ذریعہ سکھانے کا نام ہے، وہ علم نہیں جو زبان کو صرف استعمال کرنا سکھاتا ہے بلکہ اقرأ باسم ربك الذی خلق، خلق الانسان من علق، اقرأ وربك الاکرم الذی علم بالقلم علم الانسان مالم یعلم" پڑھو، تمہارا رب بڑا کریم ہے، وہ تمہاری ضرورتوں سے، تمہاری کمزوریوں سے کیسے ناآشنا ہو سکتا ہے؟ اقرأ وربك الاکرم الذی علم بالقلم، آپ خیال کیجیے کہ قلم کا رتبہ اس سے زیادہ کس نے بڑھایا ہوگا کہ اس غار حرا کی پہلی وحی نے بھی وہ قلم جو شاید ڈھونڈنے سے بھی مکہ میں کسی گھر میں نہ ملتا، مجھے اس میں شک ہے کہ وہ قلم اگر آپ اسے تلاش کرنے کے لئے نکلتے تو معلوم نہیں کس ورقہ بن نوفل کے گھر میں ملتا یا فلاں کاتب کے یہاں جو عجم سے کوئی چیز سیکھ کر آیا ہو، اس کے گھر میں ملتا اور وہ قلم جس کا استعمال عربی شاعری میں بھی بہت کم ہے، آپ اگر عرب شعراء کے دیوان پڑھیں، پڑھتے ہی چلے جائیں تو اس میں قلم کا نام آپ بہت کم پائیں گے۔

سب کا خلاصہ، علم الانسان مالم یعلم

اور پھر ایک بہت بڑی انقلاب انگیز اور لافانی حقیقت بیان کی کہ علم کی کوئی انتہا نہیں۔ "علم الانسان مالم یعلم" سائنس کیا ہے؟ علم الانسان مالم یعلم، ٹیکنالوجی کیا ہے؟ "علم الانسان مالم یعلم" انسان چاند پر جا رہا ہے یہ کیوں؟ "علم الانسان مالم یعلم" یہ جو خلا کو ہم نے طے کر لیا ہے اور ہم نے دنیا کی وسعتیں سمیٹ لی ہیں اور دنیا کی طنابیں کھینچ لی ہیں اور سورج کی شعاعوں کو بقول اقبال کے گرفتار کر لیا ہے اور ستاروں کے درمیان اپنی رہگذر پیدا کی ہے، کیا ہے؟ علم الانسان

مالم یعلم" علم اشیار کی جہانگیری۔

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جس امت کی اور جس پیغام کی بنیاد قرارت سے پڑی، فن قرارت سے پڑی اور قلم کے ذکر سے پڑی، اس ملت کا، اس قوم کا، اس امت کا ساتھ کبھی قلم سے نہیں چھوٹ سکتا، ان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اب اس امت کے لئے جو دانشگاہ تعمیر کی جائے، جو نظام تعلیم مرتب کیا جائے اس میں جو بنیادی چیز ہو، جو اصل کارفرما اور رہنما اصول ہے' وہ یہ ہے کہ یہ علم، یہ نظامِ تعلیم ان اندار پر، ان حقائق پر اور ان عقائد پر ایمان کو راسخ کرے اور یہ پختگی صرف دل کی راہ سے نہیں بلکہ دماغ کی راہ سے بھی ہو، یعنی دل و دماغ دونوں مطمئن ہونے چاہئیں، اگر دل و دماغ دونوں مطمئن نہیں ہیں تو فرد کی زندگی میں کشمکش پیدا ہو گی اور یہ کشمکش پھر وسیع ہوتی جائے گی۔ پہلے وہ اپنے اندر ایک دوسرے سے دست بگریباں پھر جماعت سے دست بگریباں ہوگا، نئی نسل اپنے معاشرہ سے دست بگریباں ہوگی، اپنے دین سے دست بگریباں ہوگی اور بہترین توانائیاں اس نسل کی اس ملبے کو مٹانے میں، اس کھنڈر کو دور کرنے میں صرف ہوں گی، پہلے اس ملبے کو ہٹاؤ پھر اس کے بعد تعمیر کرو اور تمام توانائیاں اس پر صرف ہو جائیں گی ہماری بعض مسلم قوموں کے رہنماؤں نے اس طریقہ پر کام کرنا شروع کیا کہ پہلے ماضی کا ملبہ ہٹائیں، پہلے حقائق و عقائد کا ملبہ ہٹائیں پھر اپنی دعوت پیش کریں، اس میں ان کی عمر بیت گئی اور ان کو جو وقت دیا گیا تھا کام کرنے کا وہ ختم ہو گیا، اور وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے، تو جامعات کا اصل مقصد یہ ہے کہ ان عقائد اور حقائق پر یقین کو استوار کریں اور صرف قلب کی راہ سے نہیں بلکہ دماغ کی راہ سے بھی کہ ایک طرف دل ان کا حلقہ بگوش ہو اور ان کو اپنی تہہ میں اپنی گہرائی میں جگہ دے تو دوسری طرف دماغ کا کام یہ ہو کہ وہ ان کے لئے دلائل فراہم کرے اور وہ بھی اس طرح سے مطمئن ہو جس طرح سے دل مطمئن ہو، اس لئے اس نظام تعلیم کی سب سے بڑی کامیابی یہ سمجھتا ہوں، خاص طور سے مسلمانوں کے سلسلہ میں کہ وہ ان حقائق پر، ان اقدار پر اس نسل کا، اس

تعلیمیافتہ نسل کا، ان اسکالرس کا، ان یونیورسٹی گریجویٹس کا، فلاسفرس کا، مفکرین کا یقین مضبوط کر دے اور ان کو اس قابل بنا دے کہ وہ دماغ سے ان کے لئے دلائل فراہم کریں، دنیا میں جو علمی ذخیرہ پرانا یا نیا پھیلا ہوا ہے، وہ اس کو اپنے اس دعوے کے ثبوت میں، یا اپنے اس مقصد کی تکمیل میں استعمال کر سکے اور استعمال کر سکے اور استعمال کرنے کا سلیقہ رکھے، میرے نزدیک ایک جامعہ کی بہترین تعریف یہ ہے۔

سیرت سازی

جامعات کا دوسرا کام سیرت سازی ہے، یونیورسٹی ایسا کیریکٹر بنائے جو اپنے ضمیر کو بقول اقبال ایک کف جو کے بدلے میں بیچنے کے لئے تیار نہ ہو، آج کل کے خلافِ اسلام فلسفے اور نظام یہ سمجھتے ہیں کہ اس بازار میں سب کی قیمت مقرر ہے، وہ اگر کم قیمت پر نہیں خریدا جا سکتا تو زیادہ قیمت پر خرید لیا جائے گا، ایک جامعہ کی حقیقی کامیابی یہ ہے کہ وہ سیرت سازی کا کام کرے، وہ کیریکٹر بنائے وہ ایسے صاحب علم افراد پیدا کرے جو اپنے ضمیر کا سودا نہ کر سکیں، جن کو دنیا کی کوئی طاقت، کوئی تخریبی فلسفہ، کوئی غلط دعوت، کوئی حکومت ان کو کسی دام خرید نہ سکے اور جو یہ کہہ سکیں کہ ؎

برو ایں دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

اور اقبال نے کہا ہے ؎

دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی — جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

دوسرا فرض یہ ہے کہ ہماری جامعات سے ایسے نوجوان نکلیں جو اپنی زندگیاں وقف کر دیں، جو

قربانی کے لئے تیار ہوں، جن کو کسی کے لئے بھوکے رہنے میں وہ لذت آئے جو پیٹ بھر کر کھانے اور نائے ونوش (ENJOY LIFE) میں آتی ہے، جن کو کھونے میں وہ لذت آئے جو بعض اوقات کسی کو پانے میں نہیں آتی، جو اپنی جوانی کی بہترین توانائیاں اور ذہن کی بہترین صلاحیتیں اور اپنے جامعہ کا بہترین عطیہ جس سے ان کی جھولی بھر دی گئی ہے، ملت کی سربلندی کے لئے، دین کی سربلندی کے لئے، اپنے ملک کو بچانے کے لئے صرف کرے، ایک باعزت ملک، باعزت ملت، صاحب پیغام ملت بنانے میں صرف کرے، یہ دو چیزیں ہیں، ایک تو یہ کہ دل و دماغ کو وہ غذا دی جائے، وہ روشنی دی جائے کہ جس سے دل و دماغ دونوں مل کر باہمی تعاون (CO-OPERATION) کے ساتھ، ایک دوسرے کی رفاقت کے ساتھ ان حقائق اور عقائد پر ایمان کو پختہ کریں اور دوسروں کو سمجھنے، قائل ہونے کا موقع دیں اور انھیں مطمئن کریں۔

آپ یہ دیکھیں کہ آپ اعلیٰ صلاحیت کے لوگ کتنی تعداد میں پیدا کر رہے ہیں، میں صفائی سے کہتا ہوں کہ اب کسی ملک کی یہ تعریف نہیں کہ وہاں کتنی یونیورسٹیاں ہیں، یہ کوتاہ نظری اب بہت پرانی ہو گئی ہے بلکہ قابل قدر بات یہ ہے کہ علم کے شوق میں، ریسرچ کی راہ میں اور علم کے پھیلانے کے جذبہ سے کتنے آدمی اپنی زندگیاں وقف کرتے ہیں، اپنی قوم کو صاحب شعور، مہذب اور باضمیر قوم بنانے کے لئے کتنی تعداد میں وہ نوجوان موجود ہیں جو اپنی ذاتی سربلندی اور ترقی سے آنکھیں بند کر کے اس مقصد کے لئے اپنے کو وقف کرتے ہیں، اصل معیار یہ ہے اور یہی معیار ہونا چاہیئے، کتنے نوجوان ایسے ہیں کہ جو دنیا کی تمام آسائشوں اور ترقیوں سے آنکھیں بند کر کے کسی گوشہ میں ٹھوس علمی کام کر رہے ہیں، ملت کی سربلندی کے لئے یا کسی نظریہ کی دریافت کے لئے یا کسی علمی تحقیق کے لئے اور اپنے ملک کو طاقتور بنانے کے لئے۔

یہی دو حقیقی مقصد ہیں، باقی صرف پڑھا لکھا دینا اور ملازمت کے قابل بنا دینا میں سمجھتا ہوں اب کسی جامعہ کے لئے قابلِ تعریف نہیں اور میں پورے یقین اور وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے

وائس چانسلر اور جو اس جامعہ کی رہنمائی کرنے والے ہیں وہ اس پوزیشن کو قبول کرنے پر کبھی تیار نہ ہونگے کہ ہماری جامعہ کا مقصد صرف یہ رہ جائے کہ پڑھے لکھے نوجوان ہزاروں کی تعداد میں پیدا ہو جائیں اور محکموں کارخانوں اور دوکانوں میں فٹ ہو جائیں اور پتہ نہ چلے کہ وہ کہاں گئے۔

مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے

اس جامعہ کا مقصد جو ایک ایسے نازک ملک میں ایسے نازک دور میں قائم ہوا ہے یہی ہونا چاہیئے کہ وہ اس انتشار کو رفع کرے جو تمام ممالک اسلامیہ میں تقریباً سو برس سے نمایاں ہے، جب مغربی تہذیب اور مغرب کی سیاسی یلغار شروع ہوئی تو اس وقت ہمارے عقائد اور حقائق کی بنیادیں ہل گئیں اور ایک ایسی ذہنی کشمکش پیدا ہوئی کہ اس پر بہترین توانائیاں داعیانِ مذہب کی صرف ہو رہی ہیں اور یہ ایک ایسی غیر فطری صورتِ حال ہے کہ جس کو جلد ختم ہونا چاہیئے۔ اب توانائیاں خالص تعمیری مقاصد اور ملک کی حفاظت و ترقی پر صرف ہونی چاہئیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ادب، شاعری، فنونِ لطیفہ، حکمت، فلسفہ، تصنیف و تالیف سب کا مقصد یہ ہے کہ آپ میں زندگی، نیا یقین پیدا ہو اور آپ کے ذریعہ سے ملت میں ایک نئی زندگی پیدا ہو۔

میں اس وقت شاعرِ اسلام ڈاکٹر محمد اقبال کے شعر پڑھوں گا جو انھوں نے اگرچہ کسی ادیب یا شاعر سے مخاطب ہو کر کہا، لیکن یہ ہم پر پوری طرح صادق آتے ہیں ؎

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن — جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو — جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے — یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا

آج ملتِ اسلامیہ پاکستان کو ایک ضرب کی ضرورت ہے اس لئے کہ قوموں کی کشتی اس کے بغیر

ساحل تک نہیں پہنچ سکتی، جن حالات سے ہم گزر رہے ہیں وہ ایک معجزہ کے طالب ہیں، یہ معجزہ اسلام کے ابدی پیغام میں مضمر ہے ؎

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا؟

اس وقت پاکستان کو ایک ضربِ کلیمی کی ضرورت ہے بلکہ تمام عرب اور اسلامی ملکوں میں بھی زندگی کی نئی روح پیدا کرنے کی ذمہ داری پاکستان پہ ہے، اسلام کے عقائد و حقائق پر ایک نیا یقین، ایک نیا اعتماد، ایک نیا سرور، ایک نیا نشہ، ایک نیا ولولۂ عمل، نئی جرأتِ اندیشہ، ایک نئی لذت، کردار، ایک نیا جذب دروں پیدا کرے، جس سے ان اونگھتی سوتی قوموں، آمادۂ زوال قوموں، ان مرتعش قوموں کو جن کے قدم بھی ڈگمگا رہے ہیں، دل بھی ڈگمگا رہے ہیں، ان کو نئی زندگی، نئے جوش سے آشنا کریں۔ آپ کی ذمہ داری صرف آپ تک محدود نہیں ہے، برصغیر کے مسلمان تعداد کے لحاظ سے تمام عالمِ اسلام پر فائق ہیں، آپ فکری طور پہ عالمِ اسلام کی رہنمائی کے لئے آگے بڑھیں اور اسلام پر اعتماد پیدا کریں اور یہ ثابت کریں کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے دور میں اسلام چل سکتا ہے، پاکستان ایک معمل ایک تجربہ گاہ ہے جو یہ ثابت کرے گا کہ اسلامی نظریات اس دور میں چل سکتے ہیں اور کامیاب ہو سکتے ہیں۔

آخر میں، میں وائس چانسلر صاحب اور آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے پوری سنجیدگی اور توجہ کے ساتھ میری باتیں سنیں۔

اِسلامی ممالک میں ذہنی کشمکش اور اسکے اسباب

یہ تقریر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد میں ۱۸ جولائی ۸۷ء کو کی گئی جس میں یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ کے علاوہ مقامی اور بیرونی سربرآوردہ حضرات، علماء، سیاسی رہنما اور سپریم کورٹ کے جج صاحبان موجود تھے۔

مقرر کا تعارف ڈاکٹر محمد صدیق شبلی نے کرایا اور اختتامی کلمات اور شکریہ کی رسم یونیورسٹی کے چانسلر ڈاکٹر شیر زماں صاحب نے ادا کی۔

حمد و صلوٰۃ کے بعد فرمایا۔

وائس چانسلر، اساتذۂ کرام، برادران عزیز!

اس جامعہ کی نسبت جس گرامی شخصیت سے قائم ہے اس کی دعوت پر مجھے یہاں آنے سے جو مسرت ہوئی وہ کم دانش گاہوں میں جانے سے ہوئی ہوگی، میں اپنی اس تقریر کا آغاز فارسی کے اس مشہور مصرعہ سے کرنا چاہتا تھا کہ ؎

"غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد"

لیکن چونکہ اس جامعہ اور اس دانش گاہ کی نسبت اقبالؔ سے ہے اس لئے اب میں اس کے بجائے جگر کا مصرع پڑھوں گا ع

"میں چمن میں چاہے جہاں رہوں مرا حق ہے فصل بہار پر"

یہ اگر اقبال کا چمن ہے تو میں بھی اس کا بلبل ہوں اور مجھے اس چمن کے کسی بھی شاخسار پر بیٹھنے کا حق ہے اسلئے میں غریب شہر نہیں ہوں، مجھے اس شہر کا ایک باشندہ یا اس چمن کا ایک بلبل سمجھیے۔

حضرات! وقت بہت کم ہے اور اقبال نے تعلیم پر جو کچھ لکھا ہے وہ آپ کے سامنے ہے، اور میں یہ گزارش کروں گا اس جامعہ کے ذمہ داروں سے کہ اسے ایک مستقل مضمون کی حیثیت سے یہاں نصاب میں داخل کریں، تعلیم کے بارے میں اقبال کا نقطۂ نظر اور اقبال کی تنقید اور ان کے خیالات پر اگرچہ مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن اس کو علیحدہ کر کے اور مستقل فن اور مستقل موضوع بنا کر اس جامعہ میں تحقیقی کام ہونا چاہیئے، اقبال ان چند خوش قسمتوں میں سے تھے جو خود اپنے الفاظ میں جدید نظام تعلیم کے آتشکدہ یا نارِ نمرود میں بیٹھ کر بہت کچھ ابراہیمی خصوصیات کے ساتھ نکلے۔

انھوں نے اس پر بھی فخر کیا ہے کہ میں اس جال میں پھنسا تھا لیکن اس کا دانہ لے کر نکل گیا، میرے بال و پر اس جال میں پھنسے نہیں رہے ؎

طلسمِ علمِ حاضر را شکستم　　ربودم دانہ و دامش گسستم
خدا داند کہ مانندِ براہیم　　بنارِ او چہ بے پروا نشستم

مشرقی ممالک کے نوجوان مغرب اور خاص طور پر انگلستان جس کو ہندوستانی ولایت کے نام سے یاد کیا کرتے تھے، تعلیم کے لئے جایا کرتے تھے (اقبال کے لئے معذرت کے ساتھ کہہ رہا ہوں جو بڑے اقبال مند ہوتے تھے ان کو وہاں کا سفر نصیب ہوتا تھا، وہ اس پر پھولے نہیں سماتے تھے، میرے شعور کی آنکھیں پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر کھلی ہیں۔ میں نے تحریک خلافت کو بہت قریب سے دیکھا ہے، میں اس کا ایک طرح سے معاصر و ہم عمر ہوں، اس زمانہ میں انگریز کا طوطی بولتا تھا، کسی کھاتے پیتے گھر کے لئے سب سے بڑے فخر کی بات یہ تھی کہ اس خاندان کا کوئی لڑکا ولایت چلا جائے، سارے ضلع میں دھوم مچ جاتی تھی کہ فلاں زمیندار صاحب، فلاں سید صاحب، فلاں شیخ صاحب، فلاں خانصاحب کے صاحبزادے ولایت

گئے ہیں۔ اس وقت مصر و شام سے کم ہندوستان سے زیادہ مغربی ممالک کی طرف نوجوانوں کا رُخ تھا۔ غیر منقسم ہندوستان سے اس وقت بہترین جوہر، اور بہترین صلاحیتیں رکھنے والے نوجوان انگلستان گئے اور وہاں خاص طور پر آکسفورڈ اور کیمبرج میں انھوں نے تعلیم پائی۔ ہم برصغیر کے مسلمان اس پر فخر کر سکتے ہیں کہ وہاں کے اسلام سوز اور اخلاق سوز ماحول کے اثرات سے جو لوگ آزاد ہو کر نکلے بلکہ ایک طرح سے باغی ہو کر نکلے ان میں ہم دو شخصیتوں کے نام لے سکتے ہیں، ایک علامہ اقبال اور ایک مولانا محمد علی جوہر، مصر بلکہ شرق وسطیٰ کو بھی اپنی طویل تاریخ میں یہ فخر حاصل نہیں، وہ کسی ایسے مغربی نوجوان تعلیم یافتہ کا نام نہیں لے سکتا جس نے اقبال کی طرح اپنی خودی کو قائم رکھا ہو بلکہ وہ خودی کا مبلّغ بن کر آیا ہو، اور مولانا محمد علی جوہر جیسا جوہر قابل جو اس تہذیب کا باغی، اس ملک کا باغی اور ایک شعلۂ جوالہ بن کر آیا، یہ ہمارے اس تختی برِ اعظم کے لئے فخر کی بات ہے، کم سے کم یہ دو نام ہیں جن کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا، ورنہ میں اور بھی بہت سے نام پیش کرتا جو وہاں سے کچھ لے کر آئے، کچھ کھو کر نہیں آئے، حقیقت کا علم تو صرف اللہ کو ہے، لیکن ہم اقبال کا کلام پڑھتے ہیں، مولانا محمد علی جوہر کی تحریریں پڑھتے ہیں کامریڈ میں اور ہمدرد میں، تحریکِ خلافت میں انھوں نے جو قائدانہ کردار ادا کیا اس کو دیکھتے ہیں، ان کی تقریریں پڑھتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مغربی تہذیب کا فکری طور پر اقبال سے بڑھ کر باغی اور مغربی سیاست اور تمدن کا محمد علی سے بڑھ کر باغی مشرق کے اسلامی ممالک میں نہیں ملتا، اقبال نے اس پر بجا فخر کیا ہے۔ انھوں نے کہا ہے ؎

نشستم با نکویان فرنگی   ازاں بے سوز تر روزے ندیدم

میں خوبانِ فرنگ کے ساتھ بیٹھا (ان کی مراد جمالِ علمی و جمالِ تہذیبی سے ہے) اپنی عمر میں کوئی ایسا بے نور دن یاد نہیں جو ویسا گزرا ہو، کبھی انھوں نے کہا ؎

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی   نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی

انھوں نے اپنی خودی کو برقرار رکھا، بلکہ وہ خودی کے مبلّغ بن کر آئے، انھوں نے مغربی علوم کے قلب و جگر

میں اتر کر مغرب کی کمزوری کو دیکھا اور اس سے فائدہ اٹھایا، آپ کی اس جامعہ کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس کا انتساب اقبال سے ہے۔

وقت کم ہے، آپ کے سامنے ایک مسئلہ رکھنا چاہتا ہوں جس پر ہماری تمام جامعات کے دانشوروں کو اور ہمارے تعلیمی پالیسی بنانے والوں کو غور کرنا چاہیئے۔ ابھی دو تین سال کا واقعہ ہے کہ میں بیروت گیا، میرے ایک بڑے ذہین وصاحب علم دوست مجھے اپنی گاڑی پر بیروت کی سیر کرا رہے تھے۔ انھوں نے گاڑی چلاتے ہوئے مجھ سے کہا کہ مولانا، آپ سے میں ایک سوال کرتا ہوں کہ ممالک اسلامیہ میں جو ذہنی، فکری و سیاسی بے چینی اور کشمکش پائی جاتی ہے یہ غیر اسلامی ممالک میں کیوں نہیں پائی جاتی، یہ ہندوستان جاپان یا سیلون میں کیوں نہیں پائی جاتی، یہ اسلامی ممالک کے ساتھ کیوں مخصوص ہے؟ یہاں ایک صف آرائی اور قیادتوں اور عوام میں دو مقابل محاذ بنے ہوئے ہیں، اسکے نتیجہ میں انقلابات کثرت سے آتے ہیں، حکومتیں تبدیل ہوتی ہیں، عوام کو اپنے قائدوں اور حکمرانوں پر بھروسہ نہیں اور برسر اقتدار طبقہ کو عوام کی طرف سے اطمینان نہیں؟ —— واقعہ یہ ہے کہ میں ان کے سوال کا تسلی بخش جواب نہیں دے سکا، ان کو باتوں میں مشغول رکھا، مگر واقعہ یہ ہے کہ خود میرے ذہن کے اندر ایک سوال پیدا ہو گیا کہ شاید اس سے پہلے یہ سوال میرے ذہن میں نہیں تھا کہ آخر کیوں ایسا ہے اور اس بے چینی کے کیا اسباب ہیں، روز ہم سنتے ہیں کہ ان ملکوں میں مستقل ٹکراؤ ہے، وہاں تہذیبوں کا ٹکراؤ ہے، مستقل فلسفہ اخلاق کا ٹکراؤ ہے، بعد میں میرے ذہن میں اس کا ایک جواب آیا، وہ میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں جس کی وجہ سے مجھ پر اور آپ پر اور ان جامعات کے ذمہ داروں پر بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

بات یہ ہے کہ جو فلسفۂ تعلیم ان غیر اسلامی ممالک میں آیا وہاں کے اقدار اور بنیادی عقائد سے متصادم نہیں تھا، ان اقدار میں اول تو جان نہیں تھی، جان تھی بھی تو ان میں ہر نئے فلسفے کو قبول کرنے کی صلاحیت تھی، ان کی تو بنیاد ہی مستحکم نہیں، بہت سیال و رقیق قسم کی چیزیں ہیں، مثلاً میں آپ کو یاد دلاتا ہوں

کہ جب جواہر لال صاحب سے پوچھا گیا کہ ہندو کی کیا تعریف ہے؟ تو انھوں نے بہت سوچنے کے بعد کہا کہ جو اپنے کو ہندو کہے وہ ہندو ہے۔ ہمارے ایک دوست نے واقعہ سنایا وہ محکمۂ تعلیم کے آدمی تھے، کہ ہم لوگ اسٹاف روم میں بیٹھے ہوئے تھے، میں نے اپنے ایک ہندو پروفیسر دوست سے کہا پروفیسر صاحب ہم سے اگر پوچھا جائے کہ دو لفظوں میں اسلام کا خلاصہ بیان کر دو تو ہم کہیں گے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر ایمان رکھنا ہے، اگر آپ سے پوچھا جائے کہ دو لفظوں میں آپ ہندوئیت کی تعریف کر دیجئے تو آپ کیا کہیں گے اور دیکھیے کسی گہرے فلسفے کی ضرورت نہیں ہے، میری لائبریری میں بہت سی کتابیں ہیں میں پڑھ لوں گا۔ آپ تو اس وقت دو لفظوں میں بتا دیجئے کہ اگر مجھ سے ہی کوئی پوچھے کہ ہندو کسے کہتے ہیں اور اس کی کیا تعریف ہے تو میں کیا جواب دوں؟ تھوڑی دیر سوچتے رہے، کہنے لگے، مسٹر قدوائی! اصل بات یہ ہے کہ جو کسی چیز میں BELIEVE نہیں کرتا وہ بھی ہندو ہے اور جو ہر چیز میں BELIEVE کرتا ہے وہ بھی ہندو ہے۔ تو ان کا نظام عقائد اگر ہے تو وہ اتنا روادار ہے کہ ہر فلسفہ کا ساتھ دے سکتا ہے، اس کا کوئی ٹکراؤ نہیں، اس لئے فرض کیجئے کہ مغرب کا نظام تعلیم جب ہندوستان میں آیا تو اس نے ہندو سوسائٹی میں کوئی بے چینی پیدا نہیں کی، کچھ پرانے لوگ تھے جو کہتے تھے کہ سمندر کا سفر نہیں کر سکتے، صبح کا نہانا ضروری ہے، اس کے بغیر کھانا نہیں کھا سکتے، اس کے اندر کیا جان ہے؟ تھوڑے دنوں کے اندر معلوم ہو گیا کہ ہم نے بے سوچے سمجھے باتیں قبول کر لی تھیں، یہ موجودہ تمدن کے ساتھ نہیں چل سکتیں، لیکن اصل مسئلہ پیش آیا ہمارے مسلم معاشرہ کو، وہاں توحید کا ایک مفہوم ہے، اس اس کے حدود معین ہیں کہ یہاں تک ایمان ہے، اس کے بعد کفر کی سرحد شروع ہو جاتی ہے، ایک وقت میں آدمی کئی مذاہب کا وفادار نہیں ہو سکتا، بیک وقت آدمی توحید و شرک کو جمع نہیں کر سکتا، اور یہ خیال کہ مغرب سب کچھ ہے اور وہی قیادت کا اہل ہے، پھر اس کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دائمی و دعالمی رہنما اور معیار ماننا، اقبال ہی کے الفاظ میں کہ ؎

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے — غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا

وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مانا تے سبل، ختم الرسل، مولائے کل بھی سمجھے اور مغربی تہذیب کو حرفِ آخر بھی سمجھے، سائنس کو علم کی معراج بھی سمجھے، دونوں باتیں جمع نہیں ہوسکتیں، اس لئے بے چینی ان ملکوں میں نہیں ہوسکتی جہاں مذہب کا کوئی مثبت معین نظام نہیں تھا، جس کو کسی بات پر اصرار نہیں کہ یہ ہدایت ہے، یہ ضلالت، وماذا بعد الحق الا الضلال فانی تصرفون' ہدایت کے بعد ضلالت کے علاوہ باقی کیا رہتا ہے' وہ کہتا ہے نور ایک ہے، ظلمات بے شمار ہیں، آپ قرآن مجید میں دیکھئے کہیں نور کی جمع استعمال نہیں ہے، کیا عربی میں نور کی جمع آتی نہیں، کوئی طالب علم کہہ دے "انوار" آتی ہے۔ آپ کے یہاں کتنے بھائیوں کے نام انوار ہوں گے ممکن ہے دو چار انوار یہاں بھی مل جائیں، تو نور کی جمع نہ صرف یہ کہ موجود ہے بلکہ غیر فصیح بھی نہیں ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ قرآن کی نظر میں نور ایک ہی ہے اور ظلمات کا کوئی حساب وشمار نہیں، ظلمات ایک کروڑ بھی ہوسکتی ہیں، لیکن نور ایک ہوگا، ومن لم یجعل اللہ لہ نوراً فما لہ من نور، جس کے لئے اللہ کی جانب سے نور نہ ملے اس کے لئے نور کا کوئی اور ذریعہ اور سرچشمہ نہیں، جس مذہب کی اور دین کی فطرت یہ ہے کہ اس پر اس کو اصرار ہے کہ تنہا وہی حق ہے، جس کو اس پر اصرار ہے کہ نور و ایمان کے حدود متعین ہیں، اس کو اس پر اصرار ہے کہ اسلام ایک تمدن بھی رکھتا ہے، خالی عقائد کا نام نہیں ہے، جب مغربی تہذیب اپنے پورے تصورات کے ساتھ، پورے اقدار حیات کے ساتھ، پورے مقاصد کے ساتھ آئی، تو اس کا اس سے ٹکراؤ لازمی تھا۔ ٹکراؤ ہوا اور خوب ہوا، پھر اس کے بعد ایک دوسرا سانحہ یہ پیش آیا کہ اس ملک و قوم کے ذہین، کھاتے پیتے گھرانے کے نوجوانوں نے مغربی تعلیم حاصل کی، اور عوام اپنی اسی حالت پر رہے' وہ اسی ورثہ کو اپنے سینہ سے لگائے رہے، نتیجہ یہ نکلا کہ وہ نیا تعلیم یافتہ طبقہ عوام کے تصورات اور عوام کے احساسات و جذبات سے اتنا بیگانہ بن گیا کہ جیسے ایک نئی قوم پیدا ہوتی ہے، یعنی دو نئی قومیں پیدا ہوگئیں، اور دوسری مصیبت یہ پیش آئی کہ جدید تعلیمیافتہ طبقہ نے محسوس کیا اور تجربوں کے بعد اس کو یہ معلوم ہوا کہ اگر وہ زندگی چاہتا ہے، قیادت باقی رکھنا چاہتا ہے تو ضروری ہے کہ عوام کے اس دینی جذبہ کو یا تو فنا کر دے یا اتنا کمزور کر دے کہ وہ اس کے راستہ میں مزاحم نہ ہو۔

نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے تعلیم کے ذریعہ، ابلاغ کے ذرائع کے ذریعہ، صحافت کے ذریعہ، ادب ولٹریچر کے ذریعہ، یہانتک کہ شاعری کے ذریعہ عوام کی اس دینی حمیت کو، اس اسلامی غیرت کو اور ان کی اس ذکاوت حس کو ختم کرنے کی کوشش شروع کردی، اب مستقل معرکہ پیش آیا ان ملکوں کو کہ انھوں نے دیکھا کہ اگر ہمیں رہنا ہے تو عوام اگر اسی طرح رہے، ان کے یہی احساسات وجذبات رہے تو کبھی یہ عوام ہمارے خلاف صف آرا ہوسکتے ہیں، یہ میں کہانی سنا رہا ہوں آپ کو مصر کی، شام کی، عراق کی، ترکی کی، میں نہیں کہتا کہ یہ ہر ملک کی کہانی ہے، اور خدا کرے اس ملک میں یہ ڈرامہ کبھی اسٹیج نہ ہو، لیکن ہے یہ ترقی یافتہ مسلم ممالک کی کہانی، ایک طبقہ ایسا پیدا ہوگیا جو اسلام سے نہ صرف یہ کہ بیگانہ تھا، بلکہ اس کو اس سے ایک طرح کا بُعد اور وحشت تھی، یہ عوام کا کیا حال ہے، یہ بالکل چھوئی موئی بن گئے ہیں، چھوئی موئی کو ہاتھ لگایا اور وہ سمٹ گئی، شرماگئی، تو کیا عوام بالکل چھوئی موئی ہیں، ان کا عقیدہ اتنا کمزور ہے، ارے بھئی اگر کچھ لوگ شراب پیتے ہیں تو پھر اس میں کون سی ایسی مصیبت آئی اور اگر ٹیلی ویژن پر یہ سب کچھ دکھلایا جاتا ہے اور اس سے لڑکوں اور لڑکیوں کے اخلاق پر اثر پڑتا ہے تو ایسی کیا قیامت آجاتی ہے؟ وہ کھائیں پئیں، دوکان اور کاروبار کریں، دولت پیدا کریں، ان کو اس سے کیا تعلق ہے، مذہب تو ایک پرائیویٹ معاملہ ہے، ان کے استادوں نے اور مغرب کی یونیورسٹیوں نے ان کے دل ودماغ میں یہ بات اتار دی ہے کہ مذہب تو ایک شخصی معاملہ ہے، اور مذہب کی بقا بھی اسی میں ہے کہ شخصی معاملہ رہے اور اب دنیا اسی طرح چل سکتی ہے کہ مذہب شخصی معاملہ سمجھا جائے۔ ان کے ذہن نے پہلے سے اس کو قبول کرلیا، اب یہاں وہ آئے تو دیکھا کہ عوام حکومت کے معاملہ میں دخل دیتے ہیں، تنقید کرتے ہیں، بات بات میں متاثر بلکہ مشتعل ہوجاتے ہیں۔ انھوں نے ایک نیا محاذ کھول دیا۔ جمال عبدالناصر کے دور میں مصری عوام کے خلاف مصر کی ساری طاقت اور اس کی مشینری لگ گئی، فوج پولیس بن گئی، مصر کے سارے وسائل وذخائر اور مصری قوم کی ساری توانائیاں اور جو جماعت برسرِ حکومت تھی اس کی ساری ذہانت اس جذبہ کے کچلنے میں لگادی گئی جو ان کے لئے کسی وقت بھی آگ کی صورت اختیار کرسکتی تھی۔ جو دَور جمال عبدالناصر کی لیڈرشپ کا گزرا یہ بجائے اسرائیل سے لڑنے کے، بجائے کمیونزم سے لڑنے

کے، بجائے الحاد سے لڑنے کے، یہ پُرامن شہریوں سے لڑنے میں صرف ہوا، اور ان دینی اور اسلامی تحریکوں کے ختم کرنے میں خرچ ہوا، اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی اس کے اثرات کہاں تک باقی رہے، یہ کہنا مشکل ہے، لیکن یہی حقیقی جنگ تھی جو وہاں لڑی گئی، یہی حقیقی جنگ ہے جو شام و عراق اور لیبیا و تونس، الجزائر اور مراکش میں لڑی جا رہی ہے، کہیں گرم، کہیں نرم، میں عرب ملکوں کے علاوہ کسی غیر عرب ملک کا نام نہیں لوں گا، یہ مصنوعی کارزار پیدا کی ہے ان دو فلسفوں نے، ان دو متوازی نظام تعلیم نے، ہمارے مدارس میں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ تو قال اللہ وقال الرسول کی تعلیم ہے اور یہاں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ اس نفی کی تعلیم ہے، جب انگریزی دورِ اقتدار (غیر منقسم ہندستان) میں آیا، اور انگریزوں کا نظامِ تعلیم آیا تو اکبرؔ نے وہ شعر کہا جس سے بہتر شعر آج تک جدید لادینی نظامِ تعلیم اور اس کے دور رس نتائج کے متعلق آج تک کسی نے نہیں کہا ہے، مغربی نظام تعلیم کے اثرات کے بارے میں اس سے زیادہ سادہ الفاظ میں، اس سے زیادہ سادہ الفاظ میں اس سے زیادہ گہری حقیقت نہیں بیان کی گئی۔

یوں قتل سے بچّوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سُوجھی

انھوں نے اس حقیقت کو بیان کیا کہ فرعون نے اپنی غباوت اور کند ذہنی سے خواہ مخواہ اپنے خلاف اتنا پروپیگنڈہ کرایا اور اپنے لئے اتنی مشکلات پیدا کیں کہ آج تک صحفِ سماوی تک میں وہ علامت ہے جبر و استبداد کی، وہ نظامِ تعلیم بدل دیتا تو بجائے بدنامی کے نیک نامی ہوتی، بجائے اس کو جہالت کی ایک علامت سمجھ لینے کے علم کا سرپرست مانا جاتا، مُربیِ مانا جاتا، اس کے نام سے کتنی یونیورسٹیاں قائم ہوتیں، کتنی اکاڈمیاں قائم ہوتیں، سعودی عرب میں بھی مغربی نظامِ تعلیم سے اب یہ کشمکش پیدا ہو رہی ہے۔

ہر ایسے ملک کو جس کو اسلام کی خدمت کرنی ہے اور جس کو اسلام کا جھنڈا بلند کرنا ہے، اپنے ملک کو اس ذہنی کشمکش سے بچانا چاہیئے، اس لئے کہ اس ذہنی کشمکش کے شروع ہو جانے کے بعد پھر وہ ساری ذہانتیں اور قوت عمل وہ سب کی سب اس میں لگ جاتی ہیں، ملک کی تعمیر میں، ملک کو مستحکم کرنے میں، سالمیت کی حفاظت میں جو توانائیاں

صرف ہونی چاہیئں اس میں صرف ہوتی ہیں، کون جیتے، کون ہارے، کس کا فلسفۂ اخلاق، کس کا فلسفہ مابعد الطبعیات کس کا فلسفۂ حیات غالب اور کارفرما ہے۔

میں اس جامعہ سے توقع کرتا ہوں کہ دوسری جامعات کے مقابلہ میں وہ یہ اصلاحی قدم پہلے اٹھائے گی اس لئے کہ جس مفکرِ اسلام سے اس کو نسبت ہے وہ موجودہ نظامِ تعلیم سے غیر مطمئن تھا، وہ اسلامی ملکوں میں اس نظامِ تعلیم کے نافذ ہونے سے ہراساں و ترساں رہتا تھا، وہ اگر زندہ ہوتے تو شاید مطالبہ اس کا کرتے کہ سب سے پہلے نظامِ تعلیم بدلا جائے اس لئے کہ انھوں نے کہا ہے کہ یہ وہ تیزاب ہے جس میں انسان کی خودی کو ڈال کر بالکل تحلیل کر دیا جاتا ہے۔

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

عمان میں ایک مکالمہ تھا۔ استاد کامل الشریف جو آج کل وہاں وزیر اوقاف ہیں، وہ، میں اور سعودی عرب کے ایک فاضل شیخ احمد جمال تینوں سے سوال کیے جا رہے تھے، یہ مکالمہ ریڈیو پر بھی نشر ہوتا تھا۔ مجھ سے کہا گیا، اس وقت کی سب سے بڑی مصیبت خصوصاً نوجوانوں کی پریشانی کا اصل سبب کیا ہے، میں نے کہا، زندگی کا تضاد، وہ بیک وقت باہمی متضاد چیزیں دیکھتے ہیں، گھر کا نقشہ کچھ دیکھتے ہیں، باپ دادا کی روایت کچھ سنتے ہیں، اسکول یا کالج جا کر کچھ سنتے ہیں، ادب پڑھتے ہیں اور لٹریچر دیکھتے ہیں تو اس میں کچھ اور دعوت پاتے ہیں، ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر وہ تفریح حاصل کرتے ہیں وہ ان کو کچھ اور دیتا ہے۔ اس نے ایسا کنفیوژن (CONFUSION) پیدا کر دیا ہے ایک ایسا باہمی تضاد اور انتشار پیدا کر دیا ہے کہ فیصلہ نہیں کر پاتے، جب تک یہ حالت ہے کہ ایک گاڑی میں دو گھوڑے جتے ہوئے ہیں، ایک مشرق کی طرف لے جا رہا ہے ایک مغرب کی طرف لے جا رہا ہے، اس گاڑی اور گاڑی پر بیٹھنے والے مسافر کا اللہ ہی حافظ ہے۔ یہ تضاد سوسائٹی سے، ہمارے نظامِ تعلیم سے ختم ہونا چاہیئے۔

میں ان الفاظ کے ساتھ اپنی گزارشات ختم کرتا ہوں اور میں وائس چانسلر صاحب کا، جسٹس افضل چیمہ صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے سفارش کی اور میں یہاں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے یہ الفاظ آپ کو یاد نہ رہیں لیکن کم سے کم اقبال کا پیام تو آپ کو یاد رہے گا۔ اب میں اقبال ہی کے اشعار پر ختم کرنا چاہتا ہوں ؎

اے پیرِ حرم! رسم و رہِ خانقہی چھوڑ
مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دے ان کو سبق خودشکنی خودنگری کا
تو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے
مغرب نے سکھایا انھیں فن شیشہ گری کا
دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی
دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

زرخیز زمین مردم خیز خِطّہ

۲۳ جولائی ۱۹۷۸ء کو زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں یہ تقریر کی گئی۔ جلسہ میں یونیورسٹی کے اعلیٰ عہدہ دار، اساتذہ اور طلبہ کے علاوہ معززین شہر، علماء اور دانشوروں کی خاصی تعداد شریک تھی۔ اس یونیورسٹی میں زیر تعلیم عرب ممالک کے طلبہ کی فرمائش پر مقرر نے اسی موضوع پر عربی میں بھی خطاب فرمایا۔

حمد و ثناء کے بعد

اساتذۂ جامعہ، بزرگان محترم اور طلبائے عزیز!

ملک کی عظمت کا حقیقی معیار

مجھے بڑی مسرت اور خوشی حاصل ہو رہی ہے کہ میں آپ کی اس یونیورسٹی میں جو اپنا ایک خاص کام اور مقام رکھتی ہے اپنے رفقاء کے ساتھ حاضر ہوا ہوں، میں اس عزت افزائی کے لئے یونیورسٹی کے ذمہ داروں کا شکر گزار ہوں۔

کسی ملک کی ترقی اور اس کی بڑائی کا معیار صرف یہ نہیں ہے کہ اس میں یونیورسٹیوں کی کتنی تعداد ہے، اس کی زمین میں زراعتی صلاحیت کتنی ہے، اس کے محاصل کتنے ہیں، اس میں کتنے سرمایہ دار پائے جاتے ہیں، اس کا معیار زندگی کتنا بلند ہے، بلکہ ملک کی عظمت کا حقیقی معیار یہ ہے کہ اس کے اہلِ علم میں بحث و تحقیق کرنے کا

کتنا ذوق پایا جاتا ہے اور خالص فنی اور تحقیقی دانش گاہیں اور جامعات کتنی ہیں؟ اگر کوئی ملک سب کچھ رکھتا ہے اس کے اندر قدرتی دولتوں کے بڑے بڑے ذخائر ہیں، فطری اور قدرتی وسائل بھی ہیں، لیکن اس میں ذوقِ تجسس نہیں ہے، تحقیق کا خالص علمی اور سنجیدہ ذوق نہیں پایا جاتا، ایسے لوگ کافی تعداد میں نہیں ہیں، جو اپنی زندگیاں وقف کر چکے ہوں، تعریف و تحسین سے بے نیاز ہو کر تحقیقی کام کرنے کے لئے اللہ تبارک و تعالیٰ کی رضا کے لئے (جو اصل مقصود ہے) اور اس ملک کی ترقی اور بہبودی کے لئے وہ دن رات کام میں لگے رہتے ہیں ان کو حکومت یا کسی ادارے سے انعام کا کوئی لالچ نہیں ہے، وہ تھکتے ہوں اور تھکنے ہی سے ان کو راحت ملتی ہو، تعطل اور بیکاری اور آرام ان کے لئے سزا ہو، ان کے لئے اس سے بڑھ کر سزا نہ ہو کہ ان کو تحقیقی کام کرنے سے روک دیا جائے، کام ہی ان کی غذا ہو، دوا ہو، ان کا انعام ہو۔

یہاں آکر خوشی حاصل ہوئی

یہاں یہ دیکھ کر کہ اس ملک میں ایک ترقی یافتہ زرعی یونیورسٹی پائی جاتی ہے اور یہاں بیرونی ممالک خاص طور سے عرب ممالک کے نوجوان اپنے ملکوں سے پڑھنے اور تحقیقات کرنے کے لئے آتے ہیں، بڑی مسرت ہوئی، اس سے ایک مسلمان اور ایک طالب علم کا دل ضرور خوش ہونا چاہیئے، خدا کا شکر ہے کہ مسلمان بھی ہوں، طالب علم بھی ہوں، اس لئے مجھے یہاں آنے سے قدرتاً خوشی حاصل ہوئی۔

اگر میں کوئی بڑا میوزیم دیکھتا یا کسی بڑے سے بڑے ایوان میں میری ضیافت و عزت افزائی کی جاتی تو مجھے وہ خوشی نہ ہوتی جو آپ کی اس دانشگاہ میں آکر ہوئی۔

اپنی بہترین صلاحیت اس ملک پر صرف کریں

مجھے امید ہے کہ جو نوجوان یہاں تعلیم پا رہے ہیں وہ اپنی بہترین صلاحیتیں اس ملک کے مفاد پر صرف

کریں گے، بجائے اس کے کہ وہ اونچی تنخواہوں کی خواہش میں امریکہ اور یورپ جائیں جس کا عام طور پر رواج ہو گیا ہے، میں پورے امریکہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہوں کہ ہمارے مشرقی ممالک کے بہترین نوجوان، بڑے باصلاحیت افراد جو اپنے ملکوں کو بہت کچھ دے سکتے تھے اور یہ ملک ان کی ذرا سی کوشش سے اپنی زمین سے خزانے اگل سکتے تھے، انھوں نے اپنے لئے اپنے ملکوں سے باہر میدان کا انتخاب کیا۔ اس سے ان افراد کا خواہ کتنا ہی بڑا فائدہ ہو، لیکن ان ملکوں کا بڑا نقصان ہوا کہ پڑھ لکھ کر جب کام کے آدمی بنے تو اغیار کی سرزمین میں پہنچ گئے تاکہ اپنی جھولی بھریں، کیا ہی اچھا ہوتا کہ اپنے ملکوں کی جھولی اپنی محنتوں سے، ان کے نتائج سے بھرتے، لیکن افسوس ہے کہ ہماری دولت اغیار کے کام آرہی ہے، اس لئے میں اس ملک کے نوجوانوں سے اور عرب نوجوانوں سے بھی (مجھے امید ہے کہ وہ یہاں رہ کر اتنی اردو سمجھنے لگے ہوں گے کہ میری بات سمجھ لیں) یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنی ذہانتیں، اپنی صلاحیتیں، اپنے مطالعے، اپنی تحقیقات کا اصل مستحق اپنے ملکوں کو سمجھیں، یہ بڑے افسوس کی بات ہے اور حب الوطنی اور غیرتِ اسلامی کے خلاف ہے کہ ہم اپنی صلاحیتوں سے ان ملکوں کو فائدہ پہنچائیں جنھوں نے تمام اسلامی ملکوں کو غلام بنا رکھا ہے، آج بالواسطہ یا بلاواسطہ سیاسی طور پر، اقتصادی طور پر، علمی اور فنی طور پر سب امریکہ اور روس کے دست نگر ہیں، ترقی یافتہ ممالک کے دست نگر ہیں، اگر ہمارے نوجوان اپنی صلاحیتیں اپنی سرزمین پر صرف کریں تو وہ بہت کچھ عطا کر سکتے ہیں اور اس راستہ سے خدا سے، اپنے خالق سے بھی بہت کچھ لے سکتے ہیں۔

نظریات، فلسفوں اور علمی تحقیقات و مسلمات کا غلبہ جاری ہے

مجھے امید ہے کہ نوجوان ان ملکوں کا مقابلہ کریں گے جو علمی تحقیقات کے ذریعہ اسلام کے قلب و دماغ پر حملہ آور ہیں، وہ زمانہ گیا کہ کوئی ملک کسی ملک کو غلام بنائے اور اگر اب بھی کہیں کسی کو اس کا شوق ہے تو وہ ایک قصہ پارینہ کی تقلید ہے، لیکن علمی نظریات، علمی تحقیقات اور علمی مسلمات کے نام پر جو باتیں پیش کی جاتی

ہیں ان کا حملہ اسلام پر ہمیشہ جاری رہا ہے اور جاری رہے گا۔ ایک زمانہ میں فلسفۂ یونان کا حملہ تھا، اس زمانہ میں اسلام نے غزالیؒ، باقلانیؒ، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور امام رازیؒ پیدا کئے۔ اس کے بعد پھر جب مغربی استعمار نے تاریخ کی راہ سے مسلمانوں پر حملے شروع کئے، مثلاً یہ کہا جانے لگا کہ کتب خانہ اسکندریہ مسلمانوں نے جلایا ہے، اور اس کو یورپ نے ایسی مسلمہ حقیقت کے طور پر پیش کیا کہ ہر پڑھا لکھا آدمی سن کر گردن جھکا لیتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ اگر میں نے اس کو ماننے سے ذرا بھی پس و پیش کیا یا انکار کیا تو میں ناخواندہ اور غیر تعلیمیافتہ سمجھا جاؤں گا، پورے عالم اسلام پر اس کا جادو چل گیا تھا کہ مسلمان علم کی کیا سرپرستی کریں گے، علم کے سلسلے کو آگے بڑھائیں گے، وہ تو ایسے غیر روادار، ایسے علم دشمن ہیں کہ اپنے خلیفہ عمر فاروقؓ کے حکم سے کتب خانۂ اسکندریہ کو آگ لگادی اور کہا کہ اگر یہ قرآن و حدیث کے مطابق ہے تو اس کی ضرورت نہیں ہے اور اگر مطابق نہیں ہے تو اس کا جل جانا ہی بہتر ہے، یورپ کے عیسائی مصنفین نے یہ بات کہی اور ہمارے تعلیمیافتہ نوجوانوں نے تسلیم کر لیا اور یہ سمجھا جانے لگا کہ یہ تاریخی حقیقت ہے۔ برصغیر میں مولانا شبلی نعمانیؒ پہلے مورخ و ناقد تھے جنھوں نے اس مسئلہ پر قلم اٹھایا اور مستقل رسالہ لکھا اور ثابت کر دیا کہ یہ محض افسانہ اور مسیحی تعصب و جہالت کا کرشمہ ہے۔ جس طرح ریاضی کی حقیقت ہوتی ہے دو دو، دو چار، اسی طرح انھوں نے تاریخی دلائل سے ثابت کر دیا کہ کتب خانہ اسکندریہ حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت اور مسلمانوں کے داخلۂ مصر سے پہلے جل چکا تھا، اور یہ متعصب عیسائیوں کا کارنامہ تھا، اسی طریقہ سے تاریخ کے راستے سے جو خیالات پیدا ہوئے اور جنھوں نے مسلمانوں کے ایمان و عقیدہ کو متزلزل کرنا شروع کر دیا جیسے "اورنگ زیب عالمگیرؒ کے متعلق مشہور کیا گیا کہ وہ ستمگر تھا، ہندو کش تھا، ظالم تھا" جزیہ ظالمانہ ٹیکس ہے" اس کا جواب بھی مولانا شبلیؒ نے دیا اور معترضین کا منہ بند کر دیا۔

علم کسی منزل پر رکتا نہیں

جب اسلام پر حملے سیاسیات کی راہ سے اقتصادیات کی راہ سے شروع ہوئے تو اسی تحتی بر اعظم کے

مسلمان فضلاء کے قلم چلے اور انھوں نے ان فلسفوں کا ان نظریات کا علمی محاسبہ کیا، علم کی تعریف یہ ہے کہ وہ کبھی کسی منزل پر جاکر رکتا نہیں اور اس میں برابر ارتقاء کا عمل جاری رہتا ہے، اس لئے یہ کہنا کہ یہ حرفِ آخر ہے، یہ علم کی حیثیت و منصب سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

اب آپ حضرات کا فرض ہے کہ علم نباتات کے ذریعہ جو غلط نظریات آرہے ہیں اور جو اسلام کے اور قرآن مجید کے عقائد، اس کی تعلیمات سے متصادم ہیں آپ ان کا ابطلان ثابت کریں، یا قرآن شریف نے جن چیزوں کی نقاب کشائی کی ہے، مثلاً قرآن کہتا ہے کہ "ومن کل شیٔ خلقنا زوجین" اور کہتا ہے کہ نباتات میں بھی ازدواج ہے، اس میں بھی جوڑا ہے، نر اور مادہ نباتات میں بھی ہوتے ہیں، مجھے معلوم نہیں کہ قرآن سے پہلے بھی کسی نے اس کا دعویٰ کیا ہو اور یہ بات پیش کی ہو، اب آپ اس کی صداقت ثابت کریں اور بتائیں کہ اس کتاب کا، اور اس نبی اُمّی کا بڑا معجزہ ہے کہ فن نباتات سے پہلے کسی نے یہ بات نہیں کہی کہ ہر چیز میں نر و مادہ ہوتے ہیں اور خاص طور سے نباتات کے متعلق تو۔ سورۂ رعد کی ابتدا میں ایسی کئی حقیقتوں کو بیان کیا گیا ہے، یہ حقیقتیں تو ایسی ہیں کہ ان پر مستقل ریسرچ کی جائے اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی یہ جامعہ اس بات کی پورے طور پر مستحق ہے کہ اس پر کام کرے اور وہ کام لوگوں کے سامنے اور پوری دنیا کے سامنے آئے۔

کاش یہ کام اسلامی ملکوں میں ہوتا

ڈارون کے نظریۂ ارتقاء نے جس طرح سے لوگوں کے دماغوں کو ماؤف کیا، نہ صرف یہ کہ علمی دنیا میں ہلچل پیدا کی بلکہ مذہبی دنیا کو بھی ہلا کر رکھ دیا، جن حضرات کا یہ موضوع ہے وہ بہتر جانتے ہیں۔ اس کی ضرورت تھی کہ عالمِ اسلام میں اس کے محاسبہ کا کام کیا جائے، اتفاق سے یورپ میں خود اس سلسلہ میں بڑا کام ہوا اور اس نظریہ کا انیسویں صدی کے آخر یا بیسویں صدی کے شروع میں جو دبدبہ قائم تھا، جو طمطراق

تھا اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ ڈارون کے نظریہ کی تنقید میں زبان کھولنا اپنی جہالت کا ثبوت دینا ہے، بہت سے لوگوں نے اس کے سامنے سپر ڈال دی تھی، اور کہنا شروع کر دیا تھا کہ قرآن کے بیان اور اس نظریہ میں کوئی منافات نہیں، لوگوں نے دونوں میں تطبیق دینی شروع کر دی تھی بلکہ نظریۂ ارتقاء کو اصل مان کر منصوصات قرآنی کی تاویل کرنے لگے تھے، لیکن اب علمی طور پر اس نظریہ کی وہ حیثیت نہیں رہی جو انیسویں[۱۹] صدی کے آخر یا بیسویں[۲۰] صدی کے اوائل میں تھی لیکن یہ کام یورپ میں ہوا، کاش کہ یہ کام اسلامی ملکوں میں ہوتا، مصر میں ہوتا، عراق میں ہوتا، ہندوستان میں ہوتا مگر افسوس ہمارے ممالک عربیہ کے فضلاء کی کوشش کا میدان ادب تھا یا تاریخ، انھوں نے تطبیقی علوم یعنی سائنس، کیمسٹری، فزکس یا اس طرح کے میدان کی طرف کم توجہ دی، اسلامی ممالک کا ایک آدمی بھی ایسا پیدا نہیں ہوا جو کسی نظریہ کا اضافہ کرتا، یا علمی دنیا سے اپنی تحقیق کا لوہا منوا لیتا، اور بین الاقوامی اعزاز کا مستحق قرار پاتا۔

آپ نوبل پرائز حاصل کریں

عزیز طلبہ اور مسلم نوجوانو! آپ اگریکلچری کی فیلڈ میں کوئی ایسا نظریہ پیش کریں کہ آپ نوبل پرائز کے مستحق قرار پائیں، آپ کو اندازہ نہیں کہ جب کسی مسلمان کو کسی تحقیقی یا علمی کام میں نوبل پرائز ملیگا تو مسلمان نوجوانوں کا حوصلہ کتنا بلند ہوگا، وہ کتنا افتخار محسوس کریں گے، میں طبقۂ علماء سے تعلق رکھنے کے باوجود اس روز سعید کا منتظر ہوں جب میں سنوں کہ کسی اسلامی ملک میں کسی نے نباتات یا زراعت کے میدان میں ایسا کام کیا ہے کہ وہ نوبل پرائز (NOBLE PRIZE) کا مستحق ٹھہرا، آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس سے مسلمان نوجوان کتنا خوش ہوں گے اور یہ وہ خوشی ہے جس پر کسی کو ملامت نہیں کی جا سکتی اور جس کا سیاسیات سے کوئی تعلق نہیں، کوئی حکومت اس پر تنقید نہیں کر سکتی۔ میں نوجوانوں کو اور عرب ممالک کے نوجوانوں کو توجہ دلاتا ہوں کہ وہ ایسا اوریجنل (ORIGINAL) تحقیقاتی، بلکہ انقلابی کام کریں جس کی طرف ساری دنیا کی نگاہیں اٹھ جائیں اور وہ مان جائے

کہ ہاں مسلمانوں میں بھی ایسی غیر معمولی دماغی صلاحیت اور عبقریت پائی جاتی ہے اور ان میں ایسے جینیئس (GENIUS) پائے جاتے ہیں۔

مسلم اقوام کے دل کی زرخیز زمین

آپ مسلم قوم کے نونہال ہیں، آپ اس زمین کی تحقیق کرتے ہیں کہ اس میں کیا کیا صلاحیتیں ہیں، اس میں کیا چیزیں پیدا کی جا سکتی ہیں، اور اس کی پیداوار کس طرح بڑھائی جا سکتی ہے، میں آپ کو ایک اور زمین کی طرف توجہ دلاتا ہوں جس کی طرف ہمارے مسلم ممالک کی بہت تھوڑی توجہ ہوئی ہے، وہ ہے ہمارے مسلم اقوام کے دل کی زمین، ہمارے مسلم اقوام کے دل میں کیسے کیسے خزانے دفن ہیں، دل کی یہ زمین کن دولتوں، کن خزانوں اور کن طاقتوں سے مالامال ہے، ان کو ابھارنا، ان کو پہچاننا، ان سے کام لینا چاہیئے، ہمارے سیاسی قائدین اور قومی رہنماؤں نے ابھی تک اس کی طرف توجہ نہیں کی ہے کہ جو قومیں ہمارے حصّہ میں آئی ہیں وہ قومیں کیسی ایمانی طاقت کیسی قربانی کی طاقت، کیسا جذبہ، کیسی گرمجوشی، کیسی سادگی، کیسی محبت اپنے اندر رکھتی ہیں، کیا اس کے لئے ضرورت نہیں کہ ایک یونیورسٹی قائم کی جائے جو دلوں کی اس سرزمین، ان مسلم اقوام کی ان صلاحیتوں کے متعلق تحقیقات کرے، اور ان کے ابھارنے کے ذرائع معلوم کرے اور پھر ان کو کلٹی ویٹ (CULTIVATE) کرے، ان کی پرورش کرے، ان کی نشوونما کرے، اگر یہ کام ہو گیا تو دنیا میں انقلاب عظیم برپا ہو جائے گا، آپ کسی تحقیق کے ذریعہ دنیا کے حالات و اخلاق میں انقلاب عظیم برپا نہیں کر سکتے، دنیا کو حقیقی فائدہ نہیں پہنچا سکتے، لیکن اس کام سے دنیا کے حالات و اخلاق میں انقلاب عظیم برپا کر سکتے ہیں، میں اقبال ہی کے الفاظ میں شکوہ سنج نہ صرف ایران سے بلکہ اس تحتی برِ اعظم بلکہ عالمِ اسلام سے ہے کہ ؎

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گلِ ایراں وہی تبریز ہے ساقی

اور پھر اپنے دل کو تسلی دوں گا اور آپ کو مژدہ سناؤں گا کہ ؎

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

زرخیز زمین مردم خیز خطہ

خدا نے آپ کو پاکستان کی سرزمین دی، اس کی مٹی بھی زرخیز، اس کی قوم بھی زرخیز، اس کا دماغ بھی زرخیز اس کا دل بھی زرخیز۔

اسی طرح ایشیا کے سارے ممالک جہاں سے یہ طالب علم آئے ہیں، زرخیز ہیں، یہی عراق کا حال ہے جو دجلہ و فرات کی وادی ہے، یہی سوڈان کا حال ہے جو نیل کا منبع ہے، وہاں کی زمین کیسی زرخیز ہے، لیکن مردم خیز بھی ہے، آپنے یہ تو سمجھا کہ زرخیز ہے، لیکن آپ نے یہ نہیں سمجھا کہ مردم خیز بھی ہے، زرخیزی کا کام تو ہو رہا ہے لیکن افسوس ہے کہ مردم خیزی کا کام ابھی شروع نہیں ہوا، ممکن ہے کہ کل ہم سنیں کہ آپ وزیر زراعت بن گئے، یہ عرب نوجوان ہیں، ہو سکتا ہے کہ ان میں کوئی وزیر زراعت ہو جائے، یہ زمانہ انقلابات کا زمانہ ہے، جمہوریت کا دور ہے اس لئے اس کا پورا امکان ہے کہ آج آپ یہاں فیصل آباد یونیورسٹی کے طالب علم ہیں لیکن کل آپ اپنے یہاں منسٹر ہوں یا لیڈر ہوں، کسی سیاسی پارٹی کے رہنما بن جائیں یا صدر جمہوریہ ہو جائیں، تو میں آپ کو یہ پیغام دیتا کہ آپ زمینوں کی زرخیزی اور مردم خیزی دونوں کی طرف توجہ دیں اور اپنے ہم وطنوں کو بتائیں کہ اللہ نے ان مسلم و عرب اقوام کو جو باطنی صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں، یورپ و امریکہ کی قومیں ان سے محروم ہیں، مسلمانوں کے اندر جو سادگی ہے، جو اخلاص ہے، اس کا ہزارواں حصہ بھی ان امریکن، یورپین اور ان غیر مسلم قوموں کو حاصل نہیں۔ آپ اس خلوص کا فائدہ اٹھائیں، مسلمان مسلمان سے کس خلوص سے ملتا ہے، ایمان کی کتنی بڑی طاقت اس کے اندر ہے اور اللہ اور اس کے رسول کے نام پر وہ کیا کر سکتا ہے، اس طاقت کو بھی نشوونما دیں، اس کو بھی بڑھائیں، آپ کا

ملک لالہ زار نہیں، بلکہ ایسا مردم خیز، زرخیز، انقلاب خیز اور ایسی بہاروں کا پیغام دینے والا بن جائے گا کہ دنیا محوِ حیرت رہ جائے گی۔

ان الفاظ کے ساتھ اپنے ان داعیوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے مجھے یہ مسرت و عزت حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا۔ اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ اس جامعہ کو نیک نام بلکہ نامور اور باعث عزت و افتخار بنائے نہ صرف اس ملک کے لئے بلکہ عالم اسلام کے لیے۔

محبّت مجھے ان جوانوں سے ہے

ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

یہ تقریر مورخہ ۲۵ جولائی ۱۹۷۸ء کو پنجاب یونیورسٹی لاہور میں اسلامی جمعیتہ الطلبہ کے کیمپ میں کی گئی۔ اس تربیتی کیمپ میں صوبہ پنجاب کے مختلف مقامات کے طلبہ اور طلبہ کی اس تنظیم کے عہدہ دار، ذمہ دار اور نمائندے موجود تھے۔

محبّت مجھے اُن جوانوں سے ہے

میرے عزیز بھائیو! مجھے آپ کی اس مجلس میں آ کر وہ مسرت ہوئی جس کو کسی ایسے دعوت کے خادم سے یا مدرسہ کے ایسے استاد سے پوچھنا چاہیئے جس کو نوجوانوں پر اور ملّت کے نونہالوں پر اپنا خونِ جگر صرف کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہو، اور جو ایسے نوجوانوں کو دیکھنے کی تمنا کرتا ہو جن کے متعلق اقبال کہا ہے ؎

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

خدا کے گھر میں ایک جگہ پر اتنے نوجوان، جنھوں نے اپنے مالک کے ساتھ عہد کیا ہو اور جنھوں نے ارادہ کیا ہو کہ وہ اسلام کی سربلندی کے لئے کام کریں گے اور صراط مستقیم پر چلتے رہیں گے۔

صراطِ مستقیم پُل صراط ہے

صراطِ مستقیم اصلاً تو صراط مستقیم ہے، لیکن کبھی کبھی پل صراط کی شکل اختیار کر لیتی ہے کہ بال سے زیادہ باریک، تلوار سے زیادہ تیز۔ خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ خدا نے ہم کو اس پل صراط کے لئے انتخاب کیا ہے اور اس راستہ سے وہ ہم کو انعام دینا چاہتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ جب مصائب پر انعامات ملنے لگیں گے قیامت میں تو وہ جنھوں نے اسلام کی راہ میں مصیبتیں اٹھائی ہیں اور بڑی بڑی مشکلات سے گزرے ہیں وہ تمنا کریں گے کہ کاش ان کی کھالیں قینچیوں سے کتری گئی ہوتیں۔ اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ اس نے ہمیں اس قابل سمجھا، اگر کوئی طالب علم محنتی ہے، اس نے واقعی پورے سال محنت کی ہے اور اپنا پورا کام کیا ہے، اگر امتحان میں پرچہ آسان آجائے تو اپنا سر پیٹ لیتا ہے کہ میں نے کس دن کے لئے محنت کی تھی، اور راتوں کی نیند حرام کی تھی، اگر یہی پرچہ آنا تھا تو پہلے سے بتا دیا گیا ہوتا، اور اگر پرچہ مشکل آتا ہے تو محنتی طالب علم سمجھتا ہے کہ اس کی محنت ٹھکانے لگی۔

اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

یہ شکوہ کرنا کہ ہمیں بہت نازک زمانہ ملا ہے اور ہماری راہ کانٹوں سے بھری ہوئی ہے، کم ہمتی کی بات ہے، بلند ہمتی کی بات یہ ہے کہ اگر راستہ آسان ہو تو آدمی کو شبہ ہونے لگے اپنے بارے میں کہ مجھے اس قابل نہیں سمجھا گیا کہ میں کسی مشکل پر چلوں، اگر زندگی ساری کی ساری سہولتوں سے لبریز ہوتی تو زندگی میں لطف نہ رہتا۔ شاعر نے خوب کہا ہے ؎

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

میں نے آپ کے سامنے سورہ کہف کی آیت پڑھی ہے جو مجھے بے اختیار یاد آئی۔

آپ کا رب آپ سے مخاطب ہے

"انهم فتية آمنوا بربهم" وہ ایسے نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے، یہاں "فتیۃ" کا لفظ آیا ہے۔ فتیۃ عربی میں فتیٰ کی جمع ہے (جمع قلت) اور فتی نوجوان کو کہتے ہیں، یہاں بہت سے الفاظ ہو سکتے تھے لیکن "فتیۃ" کا لفظ اختیار کیا گیا۔ انهم فتية آمنوا بربهم وہ چند جو اپنے رب پر ایمان لائے، اپنے رب پر ان کا عقیدہ مستحکم ہوا، زدناهم هدى اور جب انھوں نے پہلی منزل طے کر لی تو دوسری منزل ہم نے طے کی کہ زدناهم هدىٰ، آپ کے کرنے کا اور ہمارے کرنے کا جو کام ہے وہ کریں پھر اللہ تعالےٰ کی مدد آتی ہے، آپ قرآن شریف میں دیکھتے ہیں "ویزدکم قوۃً الیٰ قوتکم" وہ تمھاری قوت میں اپنی قوت کا اضافہ کرے گا، تمھارے پاس جو ہے لاکر رکھ دو ہم اس میں اضافہ کریں گے" ان تنصروا الله ینصرکم" تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمھاری مدد کرے گا۔ چنانچہ بنی اسرائیل سے خطاب کیا گیا" یا بنی اسرائیل اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم واوفوا بعهدی اوف بعهدکم" اے یعقوب کی اولاد میری نعمت کو یاد کرو، اور میرے عہد کو تم وفا کرو، تمھارے عہد کو میں وفا کروں گا"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک مرتبہ شکایت کی گئی کہ پانی نہیں ہے، آپ اللہ سے دعا کر سکتے تھے اور پانی آسمان سے برس سکتا تھا، لیکن آپ فرماتے ہیں کہ جو پانی باقی ہے لے آؤ، پانی جب آتا ہے تو اس میں انگشت مبارک ڈال دیتے ہیں تو وہ ابلنے لگتا ہے، آپ سے عرض کیا گیا کہ کھانے کو کچھ نہیں ہے، آپ نے فرمایا کہ جو کچھ ہے لے آؤ، سوکھی کھجوریں، خشک روٹیاں اور جو وغیرہ لوگ لائے، تھوڑا سا ذخیرہ تھا، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دعا کی، ہاتھ لگایا اور وہ بڑھ گیا اور سارے لشکر کے لئے کافی ہو گیا، اللہ کا رسول حضرت عیسیٰ کی طرح یہ دعا بھی کر سکتا تھا کہ" ربنا انزل علینا مائدۃ من السماء مگر چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس امت کو مختلف ادوار سے گزرنا تھا، اس امت کو

اندرونی طاقت اور عزم و ارادہ سے کام لینا تھا، اس لئے اس کی تعلیم دی گئی، یہ عہد ہاتھ پہ ہاتھ رکھنے کا نہیں ہے، یہ عہد عمل کا ہے، جد و جہد اور کوشش کا ہے، اس لئے امّت سے کہا گیا کہ تمھارے پاس جو ہے اس کو پیش کرو، پھر ہم اس میں اضافہ کریں گے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کو بھی اسی طرح پیش کیا گیا ہے، آپ نے تین سو تیرہ آدمیوں کو لے جاکر میدان بدر میں کھڑا کردیا، آپ یہ بھی کر سکتے تھے کہ پھونک مار دیتے، کنکر پھینک دیتے، لیکن آپ مدینہ سے چل کر آئے، مدینہ سے بدر کا فاصلہ ۸۰ اسّی میل کے قریب ہے، اس کو طے فرمایا، اس زمانہ کے طریقۂ جنگ کے مطابق صفوں کی ترتیب کی، جیسے ایک فوجی قائد کرتا ہے، یہ ہے صحیح طریقۂ سنتِ نبویؐ۔

مسئلہ ربوبیت کا تھا

میں نے آپ کے سامنے آیت پڑھی کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "انھم فتیۃ" وہ گنتی کے چند نوجوان تھے، حکومت وقت نے غذائی سامان اور معاشی وسائل پر قبضہ کر رکھا تھا، وہ غلہ دے تو لوگوں کو غلہ ملے، وہ لوگوں کو ملازمتیں دے تو لوگوں کو ملازمتیں ملیں، تو وہ حکومت گویا ایک طرح سے "مصنوعی رب" بن گئی تھی، "امنوا بربھم" لیکن وہ اپنے حقیقی رب پر ایمان لائے کہ ہمارا پالنے والا، ہمیں غذا دینے والا، ہماری زندگی کی ضروریات پوری کرنے والا، ہمیں عزت دینے والا وہ کوئی اور ہے، وہ مالک الملک ہے، وہ رب حقیقی ہے جب انھوں نے یہ منزل طے کرلی تو "زدناھم الھدیٰ" ہم نے ان کی ہدایت میں اضافہ کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہدایت کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور اس کی معرفت ہے، ہدایت وہاں سے ملتی ہے، اپنی دماغی صلاحیت اپنی ذہانت سے، اچھی تحریروں سے، محض مطالعہ سے، کتب خانہ کے علمی ذخیرہ سے نہیں ملا کرتی، ہدایت کی نسبت اپنی طرف کی ہے اور بادشاہوں کے اندازِ خطاب کی طرح جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے، "زدناھم ھدی" ہم نے ان کی ہدایت میں اضافہ کیا تو وہ کہیں سے کہیں پہنچ گئے، اللہ کے سامنے سر جھکایا، اس سے مانگنا شروع

کیا، اس کی معرفت پر محنت کی، اس کی صفاتِ عالیہ اور اسمائے حسنیٰ کی معرفت وفہم حاصل کرنے میں انھوں نے غور وفکر سے کام لیا تو ہم نے ان کی ہدایت کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

نوجوانوں کا جذبۂ عمل

اب مشکلات کا سامنا پڑا، یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب عیسائیت نئی نئی جزیرہ نمائے سینا اور اپنے اصل مرزبوم سے نکل کر روما پہنچی تو وہاں کٹر قسم کی بت پرست حکومت تھی، جب یہ داعی وہاں پہنچے تو ان کی تبلیغ سے نوجوان بھی متاثر ہونے لگے، تاریخ کے بہت سے ادوار میں ایسا نظر آتا ہے کہ نوجوان پہلے متاثر ہوئے ہیں، اس لئے کہ زیادہ عمر رکھنے والے معمر لوگوں کے ساتھ بہت سے وزن بندھے ہوتے ہیں، جیسے تیرنے کے لئے آپ دریا میں جاتے ہیں، جتنے ہلکے ہوں گے اتنی ہی آسانی سے تیر سکیں گے، لیکن اگر کسی کے ساتھ بوجھل پتھر بندھے ہوں، کچھ سامان بھی اس کے ساتھ ہو تو اس کے لئے دریا کو پار کرنا مشکل ہوگا، جو جتنا ہلکا ہوتا ہے وہ اتنی ہی جلدی منزل طے کرتا ہے۔

سبک سار مردم سبک تر روند

خاندان، روایات، بادشاہ اور حکمرانوں سے تعلقات اور رسم ورواج کے پتھر معمر لوگوں کی راہ میں جیسے حائل ہوتے ہیں، نوجوانوں کے راستے میں حائل نہیں ہوتے، رکاوٹ نہیں بنتے، نیا خون، نئی عمر، نیا جوش، نئی امنگیں، نئے حوصلے تھے، ایک آواز ان کے کان میں پڑی، دیکھئے قرآن مجید میں سورۂ آل عمران میں آیا ہے: "ربنا اننا سمعنا منادیا ینادی للایمان ان امنوا بربکم فآمنا" پروردگار! ہمارے قبول حق کی تاریخ بس اتنی ہے کہ ہمارے کان میں ایک آواز پڑی، ایک منادیٔ حق نے کہا اپنے رب پر ایمان لاؤ، ہم ایمان لے آئے، تو یہ نوجوان جو تھے، ان کے پاؤں میں وہ بیڑیاں نہیں پڑی تھیں، جو اکثر پرانی نسل کے لوگوں کے پاؤں پڑی رہتی ہیں، اس لئے فخر کے ساتھ کہا گیا "فآمنا"، کہ ان کو کوئی دیر نہیں لگی ایمان لانے میں۔

وادئ گلزار، وادئ پُرخار

اب وہ وادیاں آئیں جو دعوت کے میدان میں آتی ہیں اور وہ دو طرح کی ہوتی ہیں ایک وادی پرخار اور ایک وادئ گلزار، وادئ پرخار تو یہ ہے کہ راستہ میں کانٹے بچھے ہوں، بلکہ انگارے بچھے ہوں اور وادی گلزار یہ ہے کہ ترغیبات، ترقی کرنے کے مواقع، انعامات، بڑی بڑی آسامیاں، بڑے بڑے عہدے، یہ وادی گلزار ہے، کبھی وادئ پرخار مشکل ہوتی ہے اور کبھی وادئ گلزار، لیکن بہت سے تجربہ کاروں کا کہنا ہے کہ وادی گلزار، وادی پرخار سے زیادہ دشوار گزار ہے، ترغیبات، ترہیبات اور تعزیرات کے مقابلہ میں زیادہ موثر ہوتی ہیں، آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ امام احمد بن حنبل رح کو ایک منزل وہ پیش آئی کہ معتصم نے خلق قرآن کے عقیدہ پر ان کو مجبور کرنا چاہا اور چاہا کہ اس مسئلہ پر اپنے دستخط کر دیں، انھوں نے انکار کیا تو معتصم نے ان کو ڈرایا، دھمکایا، وہ نہیں مانے تو ان کو دربار میں بلایا اور کہا کہ احمد تم اگر میری بات مان لوگے تو میرے ولی عہد کی طرح میرے محبوب و مقرب بن جاؤگے اور اس جگہ پر بیٹھو گے۔ انھوں نے کہا، امیر المومنین! کتاب و سنت سے کوئی دلیل لائیے تو میں اس کو مان لوں۔ وہ جھنجھلایا اور اس نے جلاد کو حکم دیا اور اس نے ایک کوڑا پوری طاقت کے ساتھ مارا۔ جلاد کہتا ہے کہ واللہ وہ کوڑا اگر ہاتھی پر پڑتا تو وہ چنگھاڑ مار کر بھاگ جاتا، لیکن وہ برابر کوڑے کھاتے رہے۔

اس کے بعد ایک دوسرا دور آیا جب معتصم کا انتقال ہوگیا اور اس کا بیٹا متوکل تخت پر بیٹھا، اس نے امام احمد کو سُرمَن رائی[1] میں طلب کیا اور بڑی خاطر مدارات کی، یہ اپنے ساتھ کچھ زادِ راہ لے گئے تھے ستو یا اسی طرح کی کوئی اور چیز۔ جب کھانے کا وقت آتا وہی کھاتے تھے اور شاہی کھانوں کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے، بعد میں متوکل نے اشرفیوں کے توڑے بھیجنے شروع کئے، تو ان کے صاحبزادے بیان کرتے ہیں کہ والد صاحب فرماتے کہ معتصم کے کوڑوں سے زیادہ متوکل کے توڑے میرے لئے امتحان کا سبب ہیں۔

---

[1] سلطنت عباسیہ کا دوسرا مستقر اور خلیفہ کی آرامگاہ

ہیں، لولا یاتون علیھم بسلطان بین اس پر کوئی دلیل کیوں نہیں لائے اور کون ہے اس شخص سے بڑا ظالم کہ جس نے اللہ پر جھوٹ گڑھا۔

تین باتیں

میرے عزیز بھائیو! یہ میں نے آپ کے سامنے سورہ کہف کی آیتیں پڑھی ہیں، اس کی تشریح کی ہے اس میں ہم کو یہ سبق ملتا ہے کہ پہلے ایمان مستحکم ہونا چاہیئے، بہت بصیرت کے ساتھ، قوت کے ساتھ، ہمارا ایمان اللہ پر، اس کی صفات پر مستحکم ہونا چاہیئے، اگر ہم طالب علم ہیں تو علمی انداز کے ساتھ، اور اگر ہم عوامی مسلمان ہیں تو بھی پوری صداقت کے ساتھ ہمارا ایمان خدا پر قائم ہونا چاہیئے۔

دوسری بات یہ ہے کہ "زدناھم ھدی" اس سرچشمۂ ہدایت سے ہمارا تعلق ہونا چاہیئے جہاں سے ہدایت کا فیضان ہوتا ہے، کتاب وسنت کے مطالعہ، اسوۂ رسول اور صحابہ اور مجاہدین اسلام کے حالات سے ہمیں طاقت حاصل کرنا چاہیئے، جس طرح کہ بیٹری چارج کی جاتی ہے۔ بسیل (CELL) جب ختم ہوجاتے ہیں تو بدلے جاتے ہیں، ہم اور آپ اس مادّی دنیا میں چلتے پھرتے ہیں، ایسے اساتذہ سے بھی پڑھتے ہیں، جن کو خود بھی پورے طور پر ان دینی وغیبی حقائق پر یقین حاصل نہیں ہوتا، ہمارا دور ایسی چیزوں سے بھرا ہوا ہے کہ قدم قدم پر ہم کو خدا سے غافل کرنے والی چیزیں ملتی ہیں اور ہمیں ان کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ہر چیز خود فراموشی اور خدا فراموشی پیدا کرنے والی ہے، ٹیلی ویژن کو دیکھئے، ریڈیو سنیئے، اخبارات پڑھیئے، حتیٰ کہ خالص ادب، جس کو پاک، معصوم اور غیر جانبدار ہونا چاہیئے، وہ بھی غیر جانبدار نہیں رہا، وہ فسق کا ایجنٹ (AGENT) بنا ہوا ہے اور بہت ہی سستا ایجنٹ باطل اقدار کا، ہمارا ادب اس وقت مشاطہ بنا ہوا ہے معصیت اور سفلی جذبات اور فحش اخلاق کا، یہ ساری چیزیں جو ہمارے چاروں طرف دریا کی طرح موجزن ہیں اور دریا میں ہم کو ڈال دیا گیا ہے، ہمارے حالات نے، ہمارے نظام تعلیم نے، ہم کو اس دریا کے حوالہ کر دیا ہے، پھر اس کا کہنا یہ ہے

یہ واقعہ ہے کہ حکومتیں کبھی یہ کرتی ہیں کبھی وہ کرتی ہیں، کبھی یہ سمجھتی ہیں کہ کوڑے سے یہ دب جائے گا، تو کوڑے دکھاتی ہیں اور جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوڑے سے نہیں دبے گا، توڑے سے دبے گا تو توڑے پیش کرتی ہیں، یہ منزل بڑی سخت ہوتی ہے، بعض مرتبہ آدمی اس طرح نہیں جھکتا، لیکن ماں باپ کے اصرار پر جھک جاتا ہے، ان کے والدین سے جو دربار سے متعلق تھے، مختلف عہدوں پر فائز تھے کہا گیا کہ اپنے لڑکے کو سمجھاؤ۔ وہ کسی چکر میں آگئے ہیں، ان کو سمجھاؤ ہماری بات مانیں، اپنا مستقبل بنائیں، تمہارے بعد آخر کون ہوگا، تمہارے ہی تو بیٹے ہوں گے، لیکن جب اس سے کام نہیں چلا تو ان کو دھمکانا شروع کیا، اور ان کو پکڑا یا اور ان کا پیچھا کیا تو اس وقت اللہ کی مدد کی ضرورت تھی۔

ہم نے ان کے دلوں کو تھام لیا

"وربطنا علی قلوبھم" ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کر دیا، ہم نے ان کے دلوں کو تھام لیا، باندھ دیا، اس لئے کہ جب کوئی چیز کھلی ہوتی ہے تو ہوا کے جھونکے سے اُڑ جاتی ہے، کسی چیز سے بندھی ہو تو پھر وہ قائم رہتی ہے، تو ہم نے ان کے دلوں کو باندھ رکھا، وہ اِدھر اُدھر ہلنے جُلنے نہ پائیں" اذ قاموا فقالوا ربنا رب السمٰوٰت والارض" وہ کھڑے ہوئے اور انھوں نے کہا کہ ہمارا رب وہی ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ کھڑے ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بیٹھے تھے اور کھڑے ہو گئے، بلکہ ان کے اندر ایک عزم پیدا ہو گیا، انھوں نے اعلان کیا کہ ہمارا پروردگار وہ ہے جو آسمان و زمین کا پروردگار ہے۔"

"لن ندعوا من دونہ الٰھاً لقد قلنا اذاً شططاً" ہم اس کے سوا کسی الٰہ، کسی معبود کی پرستش نہیں کریں گے، اگر ہم نے اپنی زبان سے یہ بات نکالی تو بڑی بیجا بات ہوگی، بڑی خلاف واقعہ بات ہوگی "ھٰؤلاء قومنا اتخذوا من دونہ آلھۃً" یہ ہماری قوم کے لوگ بڑے اچھے سنجیدہ لوگ معلوم ہوتے ہیں، بڑے باوقار لوگ ہیں، تجربہ کار ہیں، اس کے باوجود انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر دوسرے معبود بنا رکھے

کہ ع "دامن تر مکن ہشیار باش"

خبردار بیٹا دامن تر نہ ہونے پائے، تو دامن بچانے کے لئے ضرورت ہے کہ "زدنا ھم ھدی" پر غور کریں، ایمان کا چراغ روشن کریں، اور حرارت و محبت پیدا کریں، جس کے بغیر ہم ان نفسانی خواہشات کا مقابلہ نہیں کر سکتے، ہم ان چیزوں کا مقابلہ خالی نظامِ جماعت اور ضابطۂ اخلاق سے نہیں کر سکتے، تجربہ کی بات بتاتا ہوں کہ زمانہ اتنا جابر واقع ہوا ہے، اس کے تقاضے اتنے قاہر ہیں کہ اگر ان کے مقابلہ میں ایمان کی طاقت نہ ہو اور وہ نمونے آپ کے سامنے نہ ہوں جو سیرت کے اندر ہم کو ملتے ہیں تو ہم زمانہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے

مسلّح مادّیت کا مقابلہ

ہماری نمازیں درست ہوں، یہ طاقت نمازوں سے پیدا ہوتی ہے، دعا سے پیدا ہوتی ہے، تلاوت سے پیدا ہوتی ہے، سجدوں سے مانوس ہونے سے پیدا ہوتی ہے، بندگانِ خدا کے پاس بیٹھنے سے پیدا ہوتی ہے، اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس مسلح مادیت کا مقابلہ کریں جس کو یورپ و امریکہ نے اپنے بہترین اسلحہ سے مسلح کر رکھا ہے، اس کی ہر چیز اتنی بھانے والی ہے کہ بڑے بڑے شیروں کے پاؤں اکھڑ جائیں تو اس کا مقابلہ ہم محض تنظیم سے، محض اپنے ضابطۂ اخلاق سے نہیں کر سکتے، اس کے لئے ہمارے اندر ایمانی طاقت ہونی چاہئے تعلق مع اللہ ہونا چاہئے، اللہ کے ساتھ ایسا تعلق ہونا چاہئے، ہم کو ایک سجدہ نصیب ہو جائے جس کی زمین بھی تاب نہیں لا سکتی ؎

وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی

اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

روحِ زمیں کانپے نہ کانپے، اپنا کلیجہ تو کانپ جائے، اپنا دل تو کانپ جائے، آنکھیں تو اشکبار ہو جائیں، یہ سجدہ جب آپ کو نصیب ہوگا تو آپ کو مادیت پہ قابو ہوگا، اب جو دور ہے، اس کا مقابلہ

کرنے کے لئے آپ کے اندر کی طاقت کی ضرورت ہے، آپ کے اندر وہ طاقت ہو، خدا کے نام سے محبت ہو، اس کے رسولؐ سے محبت ہو، سنتوں کا اہتمام اور اس کی عظمت آپ کے دل میں بیٹھی ہوئی ہو، سب سے کوتاہیاں ہوتی ہیں، لیکن اپنی کوتاہیوں کو آپ سمجھیں، ان پر اصرار نہ کریں، ان کے لئے دلیلیں نہ دیں، بلکہ یہ کہیں کہ آئیڈیل تو وہی ہے، اسوہ تو وہی ہے، کرنا تو ہم کو وہی ہے، خدا آپ کو توفیق دے گا اور یہ کوتاہیاں بھی معاف کر دے گا، بہت ہی پیچیدہ اور نازک دور رہا ہے اور آپ کے حصہ میں آیا ہے، اس میں اگر دین کے تقاضے پورے کئے اور اسلام کے جھنڈے کو ہم نے سرنگوں ہونے نہیں دیا تو آپ کو جو بھی دنیا میں ملے گا وہ تو خیر ملے گا، لیکن آخرت میں جو کچھ ملے گا، اس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اسلام کے ہاتھ میں رہنمائی

یہ بڑی قابل قدر بات ہے کہ نوجوانوں میں ایک نئی تحریک پیدا ہو رہی ہے، اور یہ بات محض اتفاق نہیں ہے، اس وقت لاہور میں آپ کو دیکھ رہا ہوں، کراچی میں میں نے دیکھا، مصر و شام میں دیکھا کہ نوجوانوں میں خاص طور سے یونیورسٹی کے طلبہ اور انجینئرنگ اور میڈیکل کالج وغیرہ کے طلبہ میں جو اسلامی جذبہ موجزن ہے، وہ افسوس کی بات ہے کہ بہت سی خالص دینی درسگاہوں کے طلبہ میں نہیں ہے، شام میں بالخصوص وہاں کی لڑکیوں میں جو یونیورسٹی اور کالجوں میں پڑھتی ہیں خدا جانے کہاں سے یہ بات آگئی ہے کہ کھل کر اسلام کی حمایت اور اس کے لئے ہر طرح کی قربانی برداشت کرتی ہیں۔ انھوں نے اصرار کیا کہ ہم شرعی پردے کے ساتھ پڑھیں گے، اگر آپ کو منظور ہو تو ہم داخلہ لیں گے، ورنہ داخلہ نہیں لیں گے۔ یہ اتفاقی بات نہیں ہے، پاکستان کے مخصوص حالات نے نوجوانوں میں ایک نیا ردعمل پیدا کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو بھی منظور ہے اور اس پردے کے پیچھے کوئی اور طاقت کام کر رہی ہے، ورنہ یونیورسٹی کے نوجوانوں میں ایک نئی تحریک، ایک نیا جذبہ، ایک نیا جوش کہاں

شے آتنا، اب اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہے کہ مسلمان نوجوان سامنے آئیں اور زمام کاران کے ہاتھ میں رہے۔ جو انھم فتیہ امنوا بربھم" کے مصداق ہیں۔

اپنے محدود تجربہ کی روشنی میں چند اور باتیں بھی عرض کرنا چاہتا ہوں، ایک بات تو یہ ہے کہ آپ سیرت سازی کی کوشش کریں، اس کے بغیر کام نہیں چلتا، ہماری دینی دعوتوں میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ سیرت کی تعمیر نہیں ہوتی اور نوجوان اگلے مرحلہ پر جاکر پست ہو جاتے ہیں، سیرت کی تعمیر کتاب وسنت، اسوۂ رسولؐ کے ماتحت ہو تو پھر پائے ثبات میں لغزش نہیں آتی۔

اپنی فکر کیجئے

دوسری بات یہ ہے کہ اپنی فکر کیجئے۔ اس زمانہ کا ایک عیب یہ بھی ہے کہ دوسروں کی فکر زیادہ اپنی فکر کم ہوتی ہے، ہمارے اجتماعی فلسفہ اور سیاسیات نے یہ ذہن پیدا کیا ہے کہ آدمی کی نظر دوسروں کے عیوب پر پڑتی ہے، اس کا محاسبہ زیادہ تر دوسروں سے ہوتا ہے، فلاں پارٹی یہ کر رہی ہے، فلاں طبقہ یہ کر رہا ہے، فلاں شخص اپنی ذمہ داری پوری نہیں کر رہا ہے، اور اس کی فرصت ہی نہیں ملتی کہ آدمی اپنا جائزہ لے اور دیکھے کہ ہم میں کیا نقص ہے۔

منفی حصہ مثبت حصہ سے بڑھنے نہ پائے

تیسری بات یہ کہ منفی حصہ مثبت حصہ سے بڑھنے نہ پائے، تناسب سے دونوں چیزیں ہوں، آپ کا مزاج یہ نہ بن جائے کہ ہر چیز کو آپ ہمیشہ ناقدانہ دیکھیں، ہر طبقہ سے جہاں آپ دین پائیں ان کے پاس بیٹھنے سے آپ کو محسوس ہو کہ ایمان بڑھتا ہے، ان کے پاس بیٹھ کر نمازوں کی طرف توجہ ہوتی ہے، نماز پڑھنے کا طریقہ آتا ہے، اس کو بھی بہت غنیمت سمجھیے بلکہ نعمت سمجھیے، اور یہ نہ سمجھیے کہ پورے دین کو انھوں نے سمجھا ہی نہیں، پورا

دین تو یہ لے کر کھڑے نہیں ہوئے تو پھر ان کے پاس بیٹھنے سے کیا فائدہ ہے، نماز ہی بہت بڑی چیز ہے آپ کو اگر نماز پڑھنی آجائے، روزہ رکھنا آجائے تو یہ کوئی معمولی بات نہیں، اسی سے پوری زندگی ڈھلتی ہے۔

اپنا مطالعہ وسیع کیجئے

چوتھی بات یہ ہے کہ مطالعہ آپ وسیع بھی کیجئے اور عمیق بھی۔ آپ کے مطالعہ میں وسعت بھی ہونی چاہیئے اور عمق بھی ہونا چاہیئے یعنی آپ اسلام کے اصل سرچشمہ سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کیجئے، آپ کو عربی زبان سے واقفیت کے بغیر ہم وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بات کس درجہ کی ہے، اس کے ساتھ ساتھ ہر قسم کا لٹریچر پڑھیں جس میں کوئی گمراہی کی بات نہ ہو، کوئی کجی نہ ہو، کسی ایک لٹریچر پر انحصار رکھنا صحیح نہیں ہے ایک ماڈل جو مکمل ہے وہ صرف رسول اللہ کا ماڈل ہے کسی انسان کا ماڈل ایسا نہیں ہے جو سب سے مستغنی ہو، کسی کے متعلق یہ خیال نہیں ہونا چاہیئے کہ یہ آخری ماڈل ہے اس کے بعد کسی کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، کسی لٹریچر پڑھنے کی ضرورت نہیں، تنگ نظری سے کم سے کم آپ کو کام نہیں لینا چاہیئے۔

میرا ہمیشہ یہ ذوق رہا اور میں کہتا بھی رہتا ہوں کہ کتابوں کا متوع ہونا چاہیئے اور جو چیزیں اچھی ہوں ان کو دیکھنا چاہیئے، البتہ اپنے ذہن میں یہ صلاحیت پیدا ہو کہ درجہ کو پہچان سکیں اور اس کے اثرات ونتائج محسوس کر سکیں۔

میرے دل میں آپ کے لئے جگہ ہے

یہ بات پورے خلوص کے ساتھ میں نے آپ سے کہی، میرا یہاں حاضر ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ میرے دل میں آپ کے لئے کیا جگہ ہے؟ اور میں آپ کی قدر کرتا ہوں، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ کہنا مجھے اکثر یاد آتا ہے کہ ایک مرتبہ کئی جلیل القدر صحابی ایک جگہ جمع تھے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ آج ہر شخص اپنی

مرادیں مانگ لے، خدا سے دعا کرے، کسی صحابی نے کہا کہ میرے پاس اتنا سونا ہو کہ میں خدا کی راہ میں صرف کروں، کسی نے کہا مجھے عبادت کی توفیق ہو، وغیرہ، حضرت عمرؓ کی باری آئی تو انھوں نے کہا بھائی میرا تو یہ جی چاہتا ہے کہ میرا گھر خالدؓ اور ابو عبیدہؓ اور فلاں فلاں سے بھرا ہوا ہو اور میں ایک ایک کو ایک ایک محاذ پر بھیجوں اور ساری دنیا میں اسلام پھیلاؤں، تو اس کی کس سے امید کی جا سکتی ہے؟ آپ ہی جیسے نوجوانوں سے۔

میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اور آپ کا شکریہ کہ مجھے آپ کے پاس آنے، خطاب کرنے اور ایک جگہ دیکھنے کی مسرت حاصل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو نظر بد سے بچائے۔ نظر بد کا لفظ میں وسیع معنوں میں استعمال کر رہا ہوں، نظر بد کا بہت ہی وسیع مفہوم ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی نظر بد سے بھی بچائے اور دوسروں کی نظر بد سے بھی، اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت فرمائے اور آپ کو اپنی صلاحیتوں کو بہترین مصرف پر صرف کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

طالبانِ علومِ نبوّت سے خطاب

وہ خطابات جو پاکستان کے مدارسِ عربیہ اور
علومِ دینیہ کے مطالعہ کے
حلقوں کے سامنے ہوئے

عہدِ حاضر کا چیلنج اور امّتِ محمّدیہ کے فرائض

جامعہ تعلیماتِ اسلامیہ فیصل آباد کے اساتذہ، طلبہ اور معززینِ شہر سے خطاب، یہ جلسہ ۲۳ جولائی ۷۶ء کو جامعہ کے وسیع ہال میں منعقد ہوا۔ خیر مقدمی کلمات اور تعارفی تقریر مولانا حکیم عبدالرحیم صاحب اشرف (ناظم و بانی جامعہ) کی ہوئی۔ اختتامی خطاب اور کلماتِ تشکر مولانا عبدالغفار حسن صاحب (استاد جامعہ اسلامیہ مدینۂ منورہ) نے ادا فرمائے۔

عہدِ حاضر کا چیلنج اور اُمّتِ محمّدیہ کے فرائض

حمد و ثنا کے بعد

هو الذی بعث فی الامیین رسولاً منهم یتلوا علیهم اٰیاته ویزکیهم ویعلمهم الکتٰب والحکمة۔

حضرات ذمہ دارانِ جامعہ، اساتذۂ جامعہ اور عزیز طلبہ!

مجھے آپ کی اس مجلس میں شرکت سے مسرت ہے اور یہاں میں کوئی اجنبیت محسوس نہیں کرتا اور مجھے محسوس بھی نہیں کرنا چاہیئے، اس لئے کہ یہ سب حاضرین ہم زبان اور ہم خیال ہیں، اور ایک ہی کشتی کے سوار اور ایک ہی

قافلہ کے مسافر ہیں، علم دین کا قافلہ اور اسلام کی دعوت اور ترجمانی کا قافلہ۔

عصرِ جدید کا چیلنج

میں سمجھتا ہوں کہ عصرِ جدید کا سب سے بڑا فتنہ اور جدید اصطلاح میں چیلنج، مادیت، نفس پرستی اور دولت ہے، یہ فتنہ ہر زمانہ میں رہا ہے، لیکن یہ فتنہ اس زمانہ میں جس طرح منظم، طاقتور، دلائل اور فلسفوں سے مسلح سامنے آیا ہے اس طریقے سے کبھی نہیں آیا تھا، واقعہ یہ ہے کہ گزشتہ دور میں مادیت کے عروج کے زمانے میں بھی جو لوگ مادیت کے نقطۂ عروج پر تھے وہ بھی احساسِ کمتری کا شکار تھے، وہ اپنی عادتوں کے غلام اور دولت واقتدار کے پرستار تھے، لیکن ان کو اس پر فخر نہیں تھا، بلکہ وہ کچھ شرمندہ شرمندہ سے نظر آتے تھے، ان کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ ہم کوئی غلطی کر رہے ہیں، ہم اپنے نفس کی تسکین تو کر رہے ہیں لیکن دماغوں کی تسکین سے عاجز ہیں، آپ اُس زمانہ کی تاریخ پڑھیے اور مادیت کے علمبرداروں کی نفسیات کا مطالعہ کیجئے، آپ کو معلوم ہوگا کہ اس زمانہ کی جو روحانی ہستیاں تھیں، بلکہ جو لوگ پستیوں سے بلند تھے، یہ دنیادار اُن کے سامنے جھک جاتے، ان کا ادب کرتے تھے، ان کے سامنے آنے سے کتراتے تھے، شرماتے تھے، ان سے آنکھیں ملانے کی تاب نہیں رکھتے تھے، ان کے پہلو میں نفس "لوامہ" تھا، یعنی وہ ضمیر جس کو اپنے جرم کا احساس ہو، ان کا ضمیر بھی اس قسم کا تھا، سارے مظالم کے باوجود وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ وہ ٹھیک راستہ سے ہٹ گئے ہیں، ان میں سے بہت سے لوگ جو مادیت کے بامِ عروج پر تھے وہ بھی بعض مرتبہ خلوتوں میں روتے تھے، اور بعض مرتبہ جب ان کا ضمیر بیدار ہوتا تھا اپنی زبان سے اقرار بھی کر لیتے تھے کہ ہمارا راستہ غلط ہے اور ہم نفس پرستی کے دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔

مشرقی اور مغربی کیمپ کا واحد نقطۂ نظر

لیکن اس زمانہ کی خصوصیت یہ ہے کہ مادیت کو ترقی وشائستگی کا منتہیٰ سمجھا جاتا ہے، مادیت کے بارے میں

مغربی اور مشرقی کیمپ میں کوئی اختلاف نہیں ہے، اختلاف صرف یہ ہے کہ مادیت کی تنظیم کس طرح کی جائے اور یہ کس فلسفہ اور کس مکتب فکر کے ہاتھ میں رہے؟ امریکہ کا اصرار ہے کہ اپنی ملکیت میں آزادانہ تصرف اور اس کے استعمال کی آزادی رکھنے کا اصول صحیح ہے اور مشرقی کیمپ، روسی کمیونسٹ بلاک اس پر یقین رکھتا ہے اور اس کی دعوت دیتا ہے کہ کسی فرد یا گروہ یا خاندان کی اجارہ داری غلط ہے، وسائل زندگی کو عام کرنا چاہیئے اور اس میں پوری مساوات ہونی چاہیئے اور اس کا اختیار حکومت کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے، لیکن زندگی کس طرح گزارنی چاہیئے، زندگی کی طاقتوں کو کس طرح استعمال کیا جائے؟ زندگی کی تنظیم کس طرح کی جائے اور وسائل و مقاصد میں کس طرح ہم آہنگی اور تعاون ہونا چاہیئے، پھر اس کے نتائج سے کس طرح متمتع ہوا جائے اور اپنی زندگی کا منتہی، منزل مقصود کس کو بنانا چاہیئے؟ انسان کی ترقی کا راز کس میں پنہاں ہے؟ اس بارے میں ان دونوں فلسفوں میں کوئی اختلاف نہیں، وہ دونوں اس چیز کے قائل ہیں کہ اصل چیز لذت، عزت اور مال و دولت کی آزادی ہے، جو جی میں آئے کرنا اور اپنے نفس کو تمتع کا پورا موقع دینا، اپنی مادی ضرورتوں کو پورا کرنا اور نفس کے جو حقوق ہیں ان کو پورا کرنا، اس مادی جسم کو، گوشت پوست کے جسم کو آرام پہنچانا ہی اصل مقصود ہے، نہ کہیں سے آئے تھے، نہ کہیں جانا ہے، نہ کسی کے سامنے حساب کتاب پیش کرنا ہے اور نہ اس سے بلند و بالا کوئی فلسفۂ اخلاق ہے، فلسفۂ روحانیت ہے، نہ کوئی فلسفۂ عقائد ہے اور نہ اس کے علاوہ کوئی حقائق ہی ہیں، حقیقتِ مطلق، حقیقتِ کلی یہ ہے کہ ہم اس دنیا میں اس لئے آئے ہیں کہ ہم اس کے ذخائر اور مواقع سے فائدہ اٹھائیں، ان کو آپس میں بانٹ کر کھائیں اور زندگی کا لطف اٹھائیں۔ اس میں جو چیز بھی حائل ہو اس کو دور کر دینا چاہیے، یعنی مقصد ہے تو نفع اٹھانا، لیکن جو چیزیں حائل ہیں ان کی تعیین میں ان میں اختلاف ہے، کوئی کہتا ہے اس میں شاہی حائل ہے، ایک خاندان کی مطلق العنانی حائل ہے، کوئی کہتا ہے اس میں ذاتی ملکیت حائل ہے، کوئی کہتا ہے اس میں سرمایہ حائل ہے اور سرمایہ داری کا استحصال حائل ہے، کوئی کہتا ہے کہ غلط تقسیم اس میں حائل ہے..... کوئی کہتا ہے کہ اس میں جہل حائل ہے، کوئی کہتا ہے کہ اس میں اچھے ادارہ اور طاقت کا فقدان، جو

ان سب وسائل کو سب پر تقسیم کرے، حائل ہے، غرض یہ کہ جو اجزا اور عوائق ہیں ان کے درمیان اختلاف ہے، لیکن مقصود میں کوئی اختلاف نہیں، اس زمانہ میں مادیت کی جو تنظیم ہوگئی ہے، جس طرح اس کو ریفائن (REFINE) کیا گیا ہے، جیسے شاندار نام دیئے گئے ہیں، جس طرح اس پر خوبصورت لیبل لگائے گئے ہیں جس طرح اس دوکان پر شاندار سائن بورڈ آویزاں کئے گئے ہیں، جس طرح اس کے پیچھے ذہین ترین اور لائق ترین افراد کی توانائیاں اور صلاحیتیں کام کر رہی ہیں، جس طرح مادیت کو عام کرنے اور اس کو زیادہ سے زیادہ قابل قبول بنانے کے لئے کوششیں کی گئی ہیں، ہمارے علم میں انسانی تاریخ کے کسی دور میں اس کا کوئی ریکارڈ نہیں ملتا۔

سب سے بڑا چیلنج مادیت

اس طرح اس دور کا سب سے بڑا چیلنج مادیت کا چیلنج ہے، یہ ایک ایسی کلی حقیقت ہے جس کے اصول و انواع تو سیکڑوں ہو سکتے ہیں، لیکن جنس ایک ہے، جنس ہے مادیت، اب اس کے انواع میں سرمایہ داری ہے، اشتراکیت بھی ہے، اشتمالیت (کمیونزم) بھی ہے اور دوسرے اقتصادی فلسفے بھی ہیں لیکن سب کا منتہیٰ اور نقطۂ جامعہ "قدرِ مشترک (COMMON FACTOR) مادیت ہے، نفس پرستی ہے۔

وہ حقائق جو مادیت پر ضرب کاری لگاتے ہیں

جب انسان اپنے پیٹ کا، اپنے معدے کا غلام تھا، اپنے اندرونی سفلی خواہشات کا غلام تھا، جب انسان دولت، عورت، زمین کے سوا کسی کو حقیقی نہیں مانتا تھا، جب دنیا کی کثیر آبادی مخلوق کے سامنے جھکتی تھی اور اس کے سامنے دبتی تھی، انبیاء علیہم السلام اپنے اپنے دور میں تشریف لائے اور انھوں نے بتایا کہ اس عالم سے ماورا ایک عالم ہے، وہ عالم اس عالم سے کہیں زیادہ وسیع، کہیں زیادہ رقیق، کہیں زیادہ حسین و جمیل ہے، اس عالم کو اگر تم دیکھ لو تو اس عالم کا گوارا کرنا مشکل ہوگا۔ اس عالم میں زندگی گزارنا ایسا

ہو گا جیسے مچھلی کو پانی سے نکال کر خشکی پر ڈال دیا جائے تو اس کا دم گھٹنے لگتا ہے، جیسے کسی آزاد پرندے کو کسی پنجرے میں بند کر دیا جائے اور وہ پنجرا بھی بہت تنگ ہو تو وہ پھڑپھڑانے لگتا ہے، اسی طریقہ سے اگر تم اس عالم کو دیکھ لو تو تمہاری آنکھیں کھل جائیں اور تم کو اس دنیا سے گھن آنے لگے جس دنیا کو تم سب کچھ سمجھ رہے ہو جس دنیا پر تم اپنی عزیز متاع، روحانیت کی، علم کی، اخلاق کی قربان کر رہے ہو اس عالم سے تمہیں گھن آنے لگے، جس طرح کسی کو ایک منٹ کے لئے گندگی کے کسی بہت بڑے ذخیرے پر کھڑا کر دیا جائے تو اس کا دم گھٹنے لگتا ہے اور اس کو متلی آنے لگتی ہے، یہ وہ چیز ہے جو قرآن نے صحف سماوی نے اپنے اپنے طور پر بیان کی ہے "قل متاع الدنیا قلیل" کہیں حطام کے لفظ سے اس کی تعبیر کی، کہیں زرع کے لفظ سے ادا کیا، یہ حطام ہے یعنی چورا ہے جیسے کھیتی کا چورا ہوتا ہے، ویسے ہی یہ بھوسا ہے، کہیں اس کو کزرع اعجب الکفار نباتہ" کہ کسان کی کھیتی لہلہائی تو اس کو بڑی بھلی لگی اور اس کی رال ٹپکنے لگی اور اس نے کہا کہ کیسا اچھا یہ چمن ہے جو کھلا ہے، کیسی یہ کھیتی ہے، پھر تھوڑی دیر کے بعد خزاں کا ایک جھونکا چلا آیا کسان کی درانتی اس پر چلی تو معلوم ہوا کہ کچھ بھی نہیں ہے۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے

سب سے پہلے اللہ کے پیغمبروں نے دنیا کی یہ حقیقت منکشف کی کہ دنیا بچوں کا کھیل ہے، جیسے ریت پر بیٹھے وہ گھر بناتے ہیں، محل بناتے ہیں، گھروندے بناتے ہیں، پھر اپنے ہاتھ سے توڑ دیتے ہیں پھر بناتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں اور پھر خود ہی توڑ دیتے ہیں، بازیچۂ اطفال ہے یہ دنیا ان عقلاء کے سامنے، عارفین کے سامنے اللہ نے یہ حقیقت منکشف کی، اگر آپ تاریخ پڑھیں تو آپ کو یہ سب کچھ نظر آجائے گا۔

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا

بغداد میں ایک مرتبہ ہم نے وہ میوزیم دیکھا جو ماقبل تاریخ کے مختلف تمدنوں، مختلف تہذیبوں، وادی فرات

کی تہذیبیں، نمرود وغیرہ کا زمانہ اور نہ معلوم کون کون سی سلطنتوں کے آثار تاریخی یادگار کے طور پر سجائے رکھے ہیں، پھر اس کے بعد تاریخ کا سفر کرتے کرتے عہدِ عباسی، اس کے بعد سلجوقیوں کا زمانہ، تاتاریوں اور مغلوں کا زمانہ، ترکوں ...... کا زمانہ، انگریزوں کا زمانہ، فیصل بن حسین کا زمانہ سامنے آیا، آپ یقین مانیے اتنی دیر میں مجھے دنیا کے تغیر و تبدل سے متلی آنے لگی، جیسے کوئی کڑوی چیز کھالے یا کوئی اوور ڈوز (OVER DOSE) ہو جائے۔ میں تھک گیا اور مجھے معلوم ہوا کہ یہ سب تماشا ہی تماشا ہے، یہ وہ سلطنتیں ہیں جن کو زوال کی منزل طے کرنے میں اور ختم کرنے میں ہزار سال، کسی کو پانچسو برس لگے ہیں، مگر ہم کو یہ معلوم ہونے لگا کہ گھنٹوں کا معاملہ ہے جو محض دھوکا تھا، یا خواب تھا، جن کو لوگ سمجھے ایک ہزار برس تھا ہم نے ان کا انجام دیکھ لیا، ہم ایسی جگہ کھڑے ہیں جہاں انسانیت کا ملبہ ہے اور ملبے پر کھڑے ہیں، ایسے ہی ہمارے بعد جو لوگ آئیں گے اور وہ یہی دیکھیں گے "قل متاع الدنیا قلیل" ہم جس کو طویل سمجھ رہے ہیں وہ کتنا قلیل ہے۔

جگہ دِل لگانے کی دنیا نہیں ہے

خدا کو اس دنیا کو آباد رکھنا ہے، اس لئے خدا نے یہ دنیا عام انسانوں پر ایسی منکشف نہیں کی ہے، جیسے عارفین پر منکشف کی تھی، ورنہ یہ دنیا ویران ہو جاتی، اس دنیا میں مکان بنانے میں کسی کا دل لگتا اور نہ کارخانہ اور فیکٹری قائم کرنے میں کسی کا دل لگتا۔ یہ حکمتِ الٰہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کو آنکھوں سے روپوش کر رکھا ہے، ورنہ اگر یہ حقیقت منکشف ہو جائے اور آخر میں جو کچھ ہونے والا ہے پہلے اگر دکھا دیا جائے تو انسان سے کچھ بھی نہ ہو سکے گا، یا تو اس کا دم نکل جائے گا یا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے گا اور انگلی ہلانا اس کا مشکل ہو جائے گا، یہ تو انبیاء علیہم السلام کا جگر اور ان کے نائبین کا جگر تھا کہ سب جانتے ہوئے انھوں نے دنیا کے حقوق ادا کئے، اپنے عزیزوں کے حقوق ادا کئے، ہمسایوں کے حقوق ادا کئے اور انسانوں کے حقوق ادا کئے، رہے تو سلیقہ کے ساتھ رہے، ذوق کے ساتھ رہے

چیلنج کو اس نے قبول کیا جو اس سطح سے بلند تھے، جن کو اللہ تعالیٰ نے قناعت کی دولت عطا فرمائی تھی، جو بادشاہوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، وہ بادشاہوں سے اس طرح باتیں کرتے تھے جس طرح مریضوں سے باتیں کرتے ہیں، وہ ان کو مریض سمجھتے تھے، ان پر رحم کھاتے تھے، اپنے حال پر خوش تھے، ان کو ان بادشاہوں پر ترس آتا تھا کہ غریب کس مصیبت میں گرفتار ہیں، اور اس میں تصنع نام کو نہ تھا، واقعی ان کے دل میں درد ہوتا تھا۔ دیکھیے ربعی بن عامر سے رستم نے جب پوچھا کہ تم کیسے آئے، تو کہا کہ تم کو دنیا کی کال کوٹھری سے نکال کر دنیا کی وسیع فضا میں داخل کرنے آئے ہیں، میں نے ابوظبی کی ایک تقریر میں کہا کہ اگر وہ اللہ کا بندہ کہتا کہ ہم تو کو دنیا کی تنگی سے نکال کر آخرت کی وسعت میں داخل کرنے آئے ہیں تو مجھے ذرا تعجب نہ ہوتا، یہ تو ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ "الدنیا سجن المومن وجنة الکافر" دنیا تو ایک قفس اور پنجرا ہے، لیکن مجھے تعجب ہوتا ہے کہ اللہ کے اس بندے نے جو پیٹ پر پتھر باندھتا ہوگا، جس کے پاس ضرورت کا راشن نہیں ہوگا، اور جسم پر چیتھڑے لپیٹے ہوگا، کیا دیکھ کر اس نے کہا کہ ہم تم کو دنیا کی کال کوٹھری سے نکال کر، جس میں تم بند ہو، وسیع فضا میں منتقل کرنے کے لئے آئے ہیں، کیا عرب کی فضا وسیع تھی؟ کیا عرب میں وسائلِ معیشت محدود ہی نہیں بلکہ تقریباً معدوم نہیں تھے؟ پیٹ بھر کھانا بھی لوگوں کو نہیں ملتا تھا، جہاں وہ اونٹوں کی کھال کے بنے ہوئے خیموں کے اندر اور مٹی کے بنے ہوئے جھونپڑوں کے اندر رہتے تھے، جہاں ان کو نیا شکار مل گیا یا اپنے ہی اونٹوں کو ذبح کر لیا تو گویا ان کی عید ہوگئی، اس دن معلوم ہوتا تھا کہ رزق کے دروازے کھل گئے، کیا دیکھ کر اللہ کے اس بندے نے کہا کہ تم اپنی خبر لو، تم تو پنجرے میں گرفتار ہو، تھوڑے سے دانے ڈال دیئے گئے ہیں اور تم اس کو کھا کر خوش ہو رہے ہو، ہم آئے ہیں تاکہ تم کو آزادی دلائیں، یہ مسلمان کی اس وقت کی نظر تھی اور یہ اس وقت کے علمائے ربانی تھے، لوگ ان کے پاس جاکر مادیت کا علاج کراتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہم کسی بلا میں مبتلا ہیں اور یہ لوگ کیسا عیش کر رہے ہیں اور کیسی جنت میں رہ رہے ہیں، چنانچہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کا مقولہ ہے "الجنة فی صدری" "میری جنت میرے سینے کے اندر ہے" اس لئے کہ ان کو اللہ پر بھروسہ تھا، وہ کسی چیز سے ڈرتے نہیں تھے، ہر وقت شکر کا غلبہ تھا، نماز میں ان کو لذت اور دعا میں ان کو

اطمینان کے ساتھ رہے، عزم کے ساتھ رہے، اپنی صلاحیت کو انھوں نے استعمال کیا، جس شہر میں رہے، جس محلہ میں رہے، اس کو صاف کیا، لیکن دل انھوں نے ایک منٹ کے لئے بھی اس میں نہیں لگایا اور برابر کہتے رہے "اللّٰھم لا عیش الا عیش الاٰخرۃ"، کیونکہ اس کا انجام جانتے تھے، اور پھر اس کے بعد انھوں نے تعمیر بھی کی، مسجدیں بھی بنائیں، اسلام بھی پھیلایا، فتوحات بھی کیں، ملکوں کو اللہ کی قلمرو میں شامل بھی کیا، نئے نئے علوم فنون وجود میں لائے، تاریخ کی انھوں نے ایسی بنیاد رکھی جو آج تک مستحکم ہے، یہ سب کچھ کیا، لیکن فرق یہ ہے کہ وہ اس دنیا کو آخری منزل نہیں سمجھتے تھے، وہ اس دنیا کو ابتدائی منزل سمجھتے تھے، اور یہی ہم میں اور ان میں فرق ہے۔

مادّیت کے راکب یا مَرکب

اُس وقت مادیت کا جو جادو تھا وہ جادو وہ لوگ توڑتے تھے جو اس مادیت سے اپنے آپ کو آزاد کر چکے تھے، جو مادیت کے غلام نہیں تھے جن کا یہ حال تھا کہ مادیت کو انھوں نے تابع کر رکھا تھا، وہ مادیت کے تابع نہیں تھے، مادیت کے راکب تھے، مادیت کے مرکب نہیں تھے۔ آج اصل فرق یہ ہے کہ مادیت کے ہم مرکب ہیں، یا ایسے بے اختیار راکب کہ

"نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں"

اور یہ ہماری حالت ہے کہ جیسے کوئی گھوڑا چھوٹ جائے اور اس کا راکب بے اختیار ہو جائے، مادیت ہمیں سرپٹ دوڑائے لئے پھر رہی ہے، ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم اس گھوڑے کو کس طرف موڑیں گے اور اس کو کس طرح چھوڑیں گے، دونوں باتیں ہمارے اختیار میں نہیں، خندق میں لے کر کود جائے گا، کس کھائی میں چھلانگ لگائے گا، سمندر میں کود جائے گا، ہمیں پتہ نہیں، تو اس وقت ہمارے پورے تمدن کا یہ حال ہے کہ تمدن ہمارے اختیار میں نہیں رہا، تمدن کی باگ ہاتھ سے چھوٹ گئی ہے، مادیت کو ہمیشہ ان لوگوں نے چیلنج کیا اور ان لوگوں کے

حلاوت محسوس ہوتی تھی اور ہر وقت جنت ہی جنت میں لوٹتے پوٹتے رہتے تھے، دیکھنے والے دیکھتے تھے وہ دنیا میں ہیں لیکن حقیقت میں جنت الفردوس میں تھے، اور ایک مرتبہ جوش میں آکر کہا کہ لوگ میرا کیا لیں گے مجھ سے کیا چھین کر لے جائیں گے، میرے عیش کا سامان تو میرے دل کے اندر ہے، اس کو کون نکال سکتا ہے، بعض عارفوں کا قول سنا ہے کہ "خدا کی قسم اگر دنیا والوں کو معلوم ہو جائے کہ ہم کس عیش میں، کس مزے میں ہیں تو ہم کو بیٹھنے نہ دیں، تلواریں لے کر جس طرح ملکوں پر حملہ کرتے ہیں اسی طرح ہم پر حملہ کریں اور تھوڑی سی جگہ جو ہم نے بنائی ہے، ایک گوشہ میں یا مسجد کے کونے میں، ہمیں یہاں بھی بیٹھنے نہ دیں، سمجھیں کہ یہاں کوئی خزانہ گڑا ہوا ہے، یہ جو فرش پر بچھا کر بیٹھا ہے، اتنا مگن ہے کہ اس کو نہ بھوک معلوم ہوتی ہے اور نہ پیاس معلوم ہوتی ہے اس کی جائے نماز کے نیچے ایک سوتا ہے، کنکش ہے، جہاں سے رزق ملتا ہے، جہاں سے فرحت اُبلتی ہے، تو وہ ہمیں اٹھادیں اس مصلے سے اور ہم سے کہیں کہ جنگل کی راہ لو، اور بیٹھ کر وہاں کھدائی کریں جیسے پٹرول کی کھدائی ہوتی ہے۔

قناعت کا جوہر

حضرات! اصل چیز کا مقابلہ وہ علماء کر سکتے ہیں، جن کے اندر قناعت کا جوہر ہو، جو کسی دام میں نہ تو آسکیں اور کہیں ؎

برو ایں دام برمرغِ دگر نہ

کہ عنقا را بلند است آشیانہ

جاؤ کسی اور کو آزماؤ، ہم بکنے والے نہیں ہیں، ہم سکوں کے عوض یا تمہارے عہدوں کے عوض، کرسی کے عوض یا عزت کے عوض ہم اپنا ضمیر بیچ ڈالیں، اپنا سکونِ قلب بیچ ڈالیں، یہ نہیں ہوگا، اس کی امید نہ کرو چنانچہ آپ عارفین کو دیکھیں، حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہیدؒ کو بادشاہِ دہلی نے پیغام دیا کہ حضرت

مجھے کبھی خدمت کا موقع نہیں دیتے کبھی تو خدمت کا موقع دیں، کبھی تو فرمائش کریں، اور ہزار روپے کی رقم پیش کرنی چاہی تو فرمایا کہ دیکھئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، "قل متاع الدنیا قلیل" اس دنیا میں سے ایک برّاعظم ایشیا ہے اور اس میں سے ایک ملک ہندوستان ہے، ہندوستان میں سے تھوڑا سا بچا کھچا آپ کے پاس ہے، اب اگر اس میں بھی کمی کردوں، جو تھوڑا سا رہ گیا ہے اس میں بھی حصہ بٹاؤں، یہ میں نہیں کرسکتا، تو انھوں نے بالکل دل سے یہ بات کہی تھی۔ واقعات تو بہت ہیں۔

برہان پور میں ایک بزرگ تھے، ان کے پاس عالمگیر نے جانا شروع کیا، وہ فرمانے لگے کہ ایک جگہ میں نے اپنے لئے انتخاب کی تھی، اگر بادشاہ کو وہ بھی پسند آگئی ہے تو میں کہیں اور چلا جاؤں، افسوس ہے کہ بزرگانِ دین کے حالات اس طرح لکھے گئے ہیں کہ ان کے اتباعِ شریعت کا جذبہ، اتباعِ سنت کا جذبہ، ان کی شب بیداری، ان کا قرآن و حدیث سے شغف یہ سب چیزیں تو بالکل منفی ہوگئیں، ان کا ذکر نہیں آتا بقول مصنفِ تاریخ گجرات (مولانا حکیم سید عبدالحئی) جس بزرگ کی سوانح پڑھو تو معلوم ہوتا ہے کہ قانونِ قدرت توڑنے کے سوا ان کا کوئی محبوب مشغلہ نہیں تھا، اور وہ عناصرِ اربعہ اور موالیدِ ثلاثہ پر ہر وقت اپنی حکومت ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے، اس کو مارا، اس کو گرایا، اگر مرا ہوا ہے تو زندہ کردیا، اگر زندہ ہے تو مار دیا، کشتی ڈوب گئی تو اس کو انگلیوں کے اشارے سے نکال دیا، ان بزرگوں کی تاریخیں بڑے غلط طریقہ سے لکھی گئی ہیں، یہ حضرات درحقیقت بڑے اہلِ علم تھے، ہوسکتا ہے بعض حضرات سے حدیث کے صحیح نہ پہنچنے یا حدیث کے علم کی کمی کی وجہ سے بعض ایسی باتیں سرزد ہوگئی ہوں جن کی حدیث سے تائید نہیں ہوتی، لیکن عام طور سے یہ حضرات بڑے اہلِ علم تھے اور علم کے بغیر کسی کو مسندِ ارشاد پر بٹھا نہیں سکتے تھے۔

میں نے آپ کے سامنے آیت پڑھی "ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلوا علیھم ایاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتب والحکمۃ" یہ ہیں نبوت کے چار شعبے جو اللہ تعالیٰ ان کے نائبین کو بطریقِ نیابت، بطریقِ خلافت عطا فرماتا ہے، ایک تو ہے تلاوتِ قرآن جس کا آپ نے نمونہ دیکھا

کئی قاریوں نے پڑھ کر سنایا اور ہر جلسہ میں سنانے کا رواج ہے اور ہر مدرسہ میں حفظ و تجوید کا انتظام ہے، اور یہ سلسلہ انشاء اللہ تا قیامت رہے گا "انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحفظون"۔ اس کے بعد بعض آیتوں میں آتا ہے "یتلوا علیھم ایاتہ ویعلمھم الکتٰب" تعلیم کتاب و حکمت کو مقدم کیا ہے اور یہ سیاق و سباق کے مطابق ہے، یہ بڑے اہلِ نظر کا کام ہے، وہ بتائے گا کہ یہاں کیوں مقدم کیا ہے اور یہاں کیوں موخر کیا ہے، کیا ماحول ہے، سورہ کا مرکزی نکتہ کیا ہے، یہ تو کام کرنے کا ہے، کتاب کی تعلیم یہ علومِ دینیہ میں، قرآن و حدیث میں، تفسیر ہے۔

حکمت سے مراد اخلاق

حکمت سے مراد اخلاقِ فاضلہ ہیں جیسا کہ ہمارے استاذ اور اپنے زمانہ کے محقق مولانا سید سلیمان ندویؒ کی تحقیق ہے کہ حکمت کا لفظ جہاں جہاں قرآن میں آیا ہے اس سے مراد اخلاق ہے۔ "ولقد اتینا لقمان الحکمۃ" اس کے بعد جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ اخلاق ہی اخلاق ہے، پہلے حکمت کا لفظ استعمال کیا ہے، پھر اس کی جو انواع بیان کی ہیں، وہ سب اخلاق سے تعلق رکھتی ہیں، سورۂ اسریٰ میں سارے اخلاق بیان کرنے کے بعد فرمایا ذٰلِکَ مِمَّآ اَوۡحٰٓی اِلَیۡکَ رَبُّکَ مِنَ الۡحِکۡمَۃِ (اے پیغمبر یہ ان (ہدایتوں) میں سے ہیں جو خدا نے دانائی کی باتیں تمہاری طرف وحی کی ہیں۔ یہاں اخلاقِ فاضلہ بیان کرنے کے بعد حکمت کا لفظ استعمال ہوا، معلوم ہوا کہ حکمت سے مراد اخلاق ہے، اخلاقِ فاضلہ۔

تزکیہ کے بغیر تعلیم کتاب و حکمت ناقص

اس کے بعد نفس کا تزکیہ کرتا ہے، اخلاقِ رذیلہ کو نکال دیتا ہے، حسد کو، قہر کو دور کرتا ہے، حبِ دنیا اور حبِ جاہ کو نکالتا ہے، اس کے بجائے اللہ کی محبت، آخرت کا جنت کا شوق دل میں بٹھاتا ہے، کوئی بھی جامعہ یا دار العلوم ہو، اس کا مقصد ان فضلاء کو تیار کرنا ہے جو تلاوت، تعلیم کتاب، تعلیم حکمت اور تزکیہ چاروں شعبوں میں انبیاءِ کرامؑ کی نیابت کا حق

ادا کرسکیں، تلاوت وحکمت ناقص رہے گی جب تک کہ تزکیہ اس کے ساتھ نہ ہو، یعنی ہمارے علماء نفس کی غلامی کے پھندے سے نکل چکے ہوں، ان کو دولت اور عزت کی بڑی سے بڑی مقدار، اپنے اصولوں سے، اپنی دعوت سے، اپنے معیار سے، اپنی تعلیم سے، اپنی زندگی کے نہج سے نہ ہٹا سکے۔

آج عرب وعجم میں کسی چیز کی کمی نہیں لیکن اگر کمی ہے ..... تو زاہدانہ زندگی اور قناعت کی، آدمی وہاں جھکتا ہے جہاں وہ چیز اس کو ملے جو اس کے پاس نہ ہو، یہ قاعدہ ہے، میرے پاس اگر کوئی چیز نہیں ہے تو میں مرعوب ہوں گا، لیکن میرے پاس اگر انیس بیس کے فرق کے ساتھ وہ چیز تو موجود ہے تو میں مار نہیں کھاؤں گا، میں سر نہیں جھکاؤں گا۔ تو اب جو لوگ مادیت پرست ہیں، مادیت کے زخم خوردہ ہیں، یہ جب علماء کے پاس جاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کسی چیز میں بھی یہ ہم سے کم نہیں ہیں اور پھر ان کے گھروں کا نقشہ دیکھتے ہیں، اور ان کے گھروں کی زندگی اور معاشرت دیکھتے ہیں، معیارِ زندگی دیکھتے ہیں تو متاثر ہونے کے بجائے ان کی بد اعتقادی بڑھ جاتی ہے، آج پاکستان میں وہ علماء تیار ہوں جو "یتلو علیہم آیاتہ ویعلمہم الکتٰب والحکمۃ ویزکیہم" پر عامل ہوں، جو نبوی وراثت کے حامل ہوں، "ان الانبیاء لم یورثوا دینارًا ولا درھمًا ولکن ورثوا ھذا العلم" عصرِ حاضر کا چیلنج ہے مادیت اور اس کا جواب ہے مادیت سے بالاتری، مادیت کی سطح سے بلند ہونا اور یہ ثابت کرنا کہ مادیت ہم کو متاثر نہیں کرسکتی، اور ہم مادیت کے غلام نہیں، میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم طیبات کو اپنے اوپر حرام کرلیں، "قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبٰت من الرزق ــــ یا ایہا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک" جب حضورؐ سے کہہ دیا گیا تو ہم کس شمار میں ہیں، ہم مباحات سے پورا فائدہ اٹھائیں، ہم اللہ کی نعمتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں، ہم اگر لذیذ کھانا کھا سکتے ہیں تو خواہ مخواہ اس کو بے لذت نہ بنائیں، جیسے بعض بعض غالی صوفیوں کے متعلق سنا کہ سالن میں پانی اوپر سے ڈال دیا تاکہ بے مزہ ہو جائے، پڑوسیوں میں تقسیم کرنے کے لئے نہیں بلکہ بے لذت بنانے کے لئے یا بہت سا نمک ڈال دیا یا بے نمک کے کھا رہے ہیں تاکہ کوئی لذت حاصل نہ ہو، یہ تزکیہ اسلام کا تزکیہ نہیں، شریعت اس کی ہمت افزائی نہیں کرتی، آپ کو اگر متوسط درجہ کا خوش ذائقہ کھانا میسر ہے تو ضرور اللہ کا شکر ادا کریں

اور ہر ہر لقمہ پر شکر کریں، لیکن ہوس "ھل من مزید" یہ جو آج ہر طبقہ میں آگئی ہے، سرمایہ کی کوئی مقدار، عزت کی کوئی مقدار اس کو مطمئن کرنے کے لئے کافی نہیں ہے اور "ھل من مزید" کا نعرہ بلند ہوتا ہے، علماء اس سے بالکل ممتاز متمیز اور نمایاں ہوں۔

چند بوریہ نشینوں کی ضرورت

آج پاکستان کو بچانے کے لئے جہاں اور بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے جن کو کراچی سے اسلام آباد تک اور اسلام آباد سے اس فیصل آباد تک کہتا چلا آرہا ہوں، ان میں ایک بڑا عنصر اور ایک بہت بڑی طاقت علماء کی زاہدانہ قناعت والی اور خودداری والی زندگی ہے، علماء ایسی زندگی کا نمونہ پیش کریں کہ یہ معلوم ہو کہ یہ کسی اور ہی طبقہ کے لوگ ہیں، یہ وراثتِ انبیاء کے وارث ہیں، یہ نائبینِ انبیاء ہیں، یہ مادیت کے زخم خوردہ اور اس کے قتیل و شہید نہیں جن کے پاس جاکر دنیا کی بے حقیقتی ظاہر ہو اور کم سے کم یہ معلوم ہو کہ دولت ہی سب کچھ نہیں ہے، جس کو سو بار غرض ہو وہ یہاں آئے، ہم کسی کے دروازے پر نہیں جاتے، اگر جاتے ہیں تو دین کی دعوت لے کر جائیں گے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے جائیں گے، کسی فریضہ، کسی سنت کے احیاء کے لئے جائیں گے اپنی غرض کے لئے کسی کی سفارش کے لئے نہیں جائیں گے۔

اس خلا کو کوئی چیز پُر نہیں کر سکتی

یہ پاکستان کی شدید ترین ضرورت ہے، اس خلا کو کوئی اور چیز پُر نہیں کر سکتی، تصنیف، تالیف، خطابت، تحقیق، سیاست، سحربیانی، کوئی چیز اس کمی کو پُر نہیں کر سکتی، یہاں کچھ آدمی ایسے چاہئیں جن کے پاس طاقت والے، سیاست والے آنے پر مجبور ہوں اور اپنے دردِ دل کی دوا پائیں، اور ان کو محسوس ہو کہ خاصانِ خدا کیسے ہوتے ہیں، ہم بالکل بے حقیقت انسان معلوم ہوتے ہیں۔

میں نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ تزکیہ واحسان کی اگر آپ کے نزدیک ضرورت نہیں تو اس کی جگہ پر کوئی چیز ایسی ہو جو وہ کام کرے جو وہ کرتی رہی ہے، یعنی جہاں آکر لوگوں کو اپنے اخلاق کی خرابی کا احساس ہو، اپنی انسانی پستی، اندرونی بیماری کا کچھ احساس ہو، جہاں آکر ایک نئی طاقت، ایک نئی روح آدمی کو حاصل ہو، میں نے عربی شاعر حطیئہ کے اس شعر پہ اس مضمون کو ختم کیا تھا ؎

اقلّوا علیهم لا أبا لابیکم
من اللوم أو سُدّوا المکان الذی سَدّوا

"بس بہت ملامت ہو چکی، ان کو تم نے بہت مٹی میں ملایا اور بہت ذلیل کیا، اب ملامت کو کم کرو، اس جگہ کو بھر و جس جگہ کو انھوں نے بھر رکھا تھا۔"

آپ ایک ڈاکٹر کا شفاخانہ بند کرتے ہیں تو خدا کے لئے کوئی دوسرا شفاخانہ اس سے بہتر تو قائم کیجئے شفاخانہ تو آپ نے بند کر دیا اور کوئی دوسرا شفاخانہ قائم نہیں کیا اور اس کے بجائے آپ نے سبیل لگا دی، اس کے بجائے آپ نے کتب خانہ کھول دیا، کتب خانہ بہت مبارک، لیکن وہ شفاخانہ کی جگہ نہیں لے سکتا، شفاخانہ کی جگہ شفاخانہ ہی لے سکتا ہے، طبیب کی جگہ طبیب ہی لے سکتا ہے، اس زمانہ کا چیلنج ہے مادیت اور اس کا جواب حقیقی، صحیح، شرعی، مسنون روحانیت، تزکیۂ نفس، جس میں کوئی چیز خلافِ شریعت نہ ہو، کوئی ایسی چیز نہ ہو جس کی نظیر کتاب وسنت میں اور عہدِ نبوی اور عہدِ صحابہ میں نہ مل سکے۔ ایک طرف تو وہ راسخ فی العلم ہوں اور ایک طرف راسخ فی الدین ہوں۔ بس میں اس پہ ختم کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ ہم کو اور آپ کو اس راستہ پہ چلنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

قرآنی مطالعہ اور اس کے آداب

یہ تقریر ۲۶ جولائی ۱۹۸۰ء کو قرآن اکیڈمی ماڈل ٹاؤن لاہور کے ایک منتخب جلسے میں کی گئی۔ اس جلسہ میں حلقہ تدبر قرآن سے تعلق رکھنے والے حضرات دور دراز کا سفر کر کے آئے تھے۔ مقرر خصوصی اور قرآن اکیڈمی کا تعارف اس کے موسس و صدر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے کرایا۔

الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یہدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ہادی لہ ونشہد ان لا الہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہ ونشہد ان محمدا عبدہ ورسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ و اصحابہ وسلم تسلیما کثیراً کثیراً۔ اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اللّٰہ یجتبیٓ اِلیہِ مَن یَّشآءُ و یہدیٓ الیہِ مَن یُّنیب ۝

قرآن مجید ہر موقع پر مشکل کشائی اور دست گیری کرتا ہے

برادران عزیز! قرآن مجید کے معجزات میں سے جن کا سلسلہ قیامت جاری رہے گا یہ بھی ہے کہ وہ ہر موقع پر مشکل کشائی اور دست گیری کرتا ہے، مجھے بارہا اس کا تجربہ ہوا کہ میں کسی تقریر کے موقع پر یہ طے نہ کر سکا کہ اپنی بات

کہاں سے شروع کروں گا اور مجھے آج کیا کہنا ہے اور قاری نے قرآن مجید کی تلاوت کی اور مجھے معلوم ہوا کہ دوسرے لوگوں کے سننے سے پہلے وہ آیتیں مجھے سنائی جارہی ہیں اور ان آیتوں کا انتخاب میرے لئے کیا گیا ہے، مجھے اپنے غیر ملکی دوروں میں بھی اس کا تجربہ ہوا کہ دن بھر کی مصروفیتوں اور نقل و حرکت میں اس پر غور کرنے کی نوبت ہی نہ آئی کہ کس موضوع پر تقریر ہوگی، کہیں تو موضوع کا تعین ہوجاتا ہے اور کہیں نہیں ہوتا تو میں نے اس کو خدا پر چھوڑ دیا کہ وہ وقت پر رہنمائی فرمائے گا، چونکہ جو چیز اس کی طرف سے آتی ہے، اس کو عارفین "وارد" کہتے ہیں، یعنی ایک عزیز مہمان جس کا ورود ہوا ہے، اس میں اپنے ارادہ اور انتخاب کو کوئی دخل نہیں، اس موقع پر بھی یہی پیش آیا، اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے عزیز قاری کو جو انہوں نے آیتیں پڑھیں اس میں ہماری رہنمائی ہوئی۔ قبل اس کے کہ میں آیت کی تشریح میں کچھ عرض کروں اور قرآن مجید کے طالب علموں کے سامنے اپنے کچھ تجربے، کچھ مشورے پیش کروں کہ حقیقت میں وہی میرے مخاطب ہیں، کچھ اپنی حقیر ذات اور علمی سفر کے بارے میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

قرآن مجید کی حکمتِ دعوت

ڈاکٹر صاحب نے بڑی خوبی سے میرا تعارف بھی کرایا لیکن میں کس قدر تعارف ضروری سمجھتا ہوں اور سنتِ یوسفی کے مطابق یہ فرض بھی خود ہی انجام دیتا ہوں۔ جب حضرت یوسفؑ کے پاس تعبیر پوچھنے والے گئے تو انھوں نے فرمایا: ذٰلکما مما علمنی ربی سب سے پہلے سامعین کو یا جو کوئی استفسار کرجائے اس کو اس اطمینان کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ جس کے پاس گئے ہیں اس سے کچھ مدد بھی مل سکتی ہے یا نہیں۔ انتخاب میں انھوں نے کچھ غلطی تو نہیں کی تو انھوں نے ضروری سمجھا کہ کہہ دیں ذٰلکما مما علمنی ربی انی ترکت ملۃ قوم لا یؤمنون باللہ وھم بالاخرۃ ھم کٰفرون ٥

یہ نبی کا کلام تھا اور اس میں اُس طرح کی خودستائی کی بو تھی، اس میں اپنی تعریف کی بو نکلتی تھی اور

دہم ہو سکتا تھا، اس لئے انھوں نے فوراً فرمادیا کہ "ذٰلکما مما علمنی ربی" میں تمھاری اس موقع پر مدد تو کرسکتا ہوں، مجھے اللہ نے یہ علم عطا فرمایا ہے، لیکن یہ علم کیوں عطا کیا ہے؟ "انی ترکت ملة قوم لایؤمنون باللہ" یہ میری ذہانت کا نتیجہ نہیں ہے، میری نجابت کا بھی یہ نتیجہ نہیں حالانکہ یہ دونوں چیزیں موجود تھیں اور بدرجۂ کمال وجمال، لیکن انھوں نے فرمایا "انی ترکت ملة قوم لایؤمنون باللہ وھم بالاٰخرة ھم کٰفرون" اس علم کا افاضہ اس لئے ہوا کہ میں نے اس قوم کی ملت چھوڑ دی جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتی اور آخرت کی منکر تھی واتبعتُ ملة اٰبائی ابراھیم و اسحاق و یعقوب" اور اس کے بعد انھوں نے وہیں سے توحید کے وعظ کا مدخل پیدا کرلیا، عزیزو! تم جس کو بڑا مسئلہ سمجھ رہے ہو اور جو مشکل تم کو یہاں لیکر آئی ہے، اس سے بڑی مشکل درپیش ہے، وہ ہے عقیدہ، یہ خواب جو تم نے دیکھا، خواب تو خواب ہی ہوتا ہے، لیکن معاملہ بیداری کا ہے، معاملہ زندگی کے مستقبل کا ہے، معاملہ ابدی اور دائمی زندگی کا ہے، مان لو تم کو خواب کی تعبیر دینے والا دنیا میں کوئی بھی نہ ملے تب بھی کوئی بڑا نقصان نہیں، لیکن اس خواب ہستی کی تعبیر دینے والا اگر کوئی نہ ملا کہ دنیا میں آنے کا مقصد کیا ہے، کائنات کا فاطر و خالق کون ہے؟ اگر اس کی صحیح معرفت نہ ملی تو اصل خطرہ یہ ہے، پھر انھوں نے اتنا ہی DOSE دیا جتنا DOSE دینا چاہیئے تھا، وہ جانتے تھے کہ یہ غرض لے کر آئے ہیں، ان کو ایک ذہنی پریشانی ہے، یہ اتنا صبر نہیں کرسکتے کہ ان کو ایک یا دو گھنٹہ تبلیغ کروں، اس لئے انھوں نے بالکل صحیح احساس تناسب کے ساتھ جو ایک حاذق طبیب رکھتا ہے اور ایک داعی حکیم رکھتا ہے، ایک ملہم رکھتا ہے، اتنا ہی ڈوز دیا جتنے ڈوز کے وہ متحمل تھے

دل کا دروازہ کبھی کبھی کھلتا ہے

آپ اس تناسب کو دیکھیئے، اس میں جمال یوسفی پورے طور پر عیاں ہے، اس میں نہ کمی ہے نہ زیادتی، نپے تولے کر جہاں رک جانا چاہیئے وہاں رک گئے، یعنی توحید کی پوری بات کہی لیکن اس کو اتنا دراز نہیں کیا کہ وہ لوگ یہ کہنے لگتے کہ آپ اگر خواب کی تعبیر دے سکتے ہیں تو دیجئے، ورنہ ہم فرصت سے آئیں گے۔ حضرت یوسفؑ نے دیکھا کہ ان کے سامنے

دماغ کا دروازہ کھلا ہے اور دل کا دروازہ کبھی کبھی کھلتا ہے، قسمت سے کھلتا ہے، کبھی کسی غرض سے کھلتا ہے، کبھی کسی پریشانی سے کھلتا ہے، اس دروازہ سے جو اصل پیغام ہے وہ داخل کردینا چاہیئے، لیکن وہ پیغام اس سبک روی کے ساتھ داخل ہو کہ وہ دروازے بند نہ ہو جائیں اور احتجاجاً بند نہ ہو جائیں، میں تو حیران رہ جاتا ہوں اور افسوس ہے کہ یہ پورا حصہ بائبل سے حذف ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ بائبل کس کی تصنیف ہے اور قرآن کس کا نازل کیا ہوا ہے، ان کو خوب اندازہ تھا کہ یہ کتنی بات کے متحمل ہو سکتے ہیں، اتنی سی بات انھوں نے کہی، مریض چاہتا ہے کہ اس کو اس کے درد کا مداوا جلد مل جائے تو انھوں نے کہا قبل اَنْ یَّاْتِیَکُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِہٖ تمہارا راشن جو مقرر ہے اس کے آنے سے پہلے تعبیر دے دوں گا، مخاطب کو بھی دو اطمینان چاہئیں، اس کی دوا مل سکتی ہے یا نہیں؟ اور جلد ملتی ہے یا نہیں؟ اس درمیان میں توحید کا وعظ کہہ دیا۔

مطالعۂ قرآن مجید سے علمی زندگی کا آغاز

میں اپنا تھوڑا سا تعارف کرانا مناسب سمجھتا ہوں کہ میں قرآن شریف کا ایک حقیر اور ادنیٰ طالب علم ہوں، میری علمی زندگی قرآن مجید ہی کے مطالعہ سے شروع ہوئی، میں نے کئی جگہ لکھا ہے کہ مجھے اللہ نے ایک ایسا استاد عطا کیا جس کو ذوق ایمانی اور ذوقِ قرآنی ملا تھا۔[1] وہ قرآن پڑھتے تھے اور روتے تھے، پہلا نقش جو مجھ پر پڑا وہ ان کی آواز کا، جو درد میں ڈوبی ہوتی تھی، یہ میری خوش نصیبی تھی، اور قرآن مجید کا اصل مزاج بھی یہی ہے۔

قرآن مجید کا مزاج صدیقی ہے

قرآن مجید کا مزاج صدیقی ہے۔ جب حضرت ابوبکر صدیقؓ سے کہا گیا کہ نماز پڑھاؤ اور حضورؐ کے مصلے پر کھڑے ہو جاؤ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ ابوبکرؓ کو اس سے معاف رکھا جائے کہ وہ "رجل بکاء" ہیں

---

[1] شیخ خلیل بن محمد یمانی (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "پرانے چراغ" مستقل مضمون)

جب وہ قرآن شریف پڑھنے لگتے ہیں تو پڑھ نہیں سکتے، ان پر گریہ غالب ہو جاتا ہے اور لوگ سن نہیں سکتے ہیں اور یہی شکایت کی تھی مشرکین قریش نے جب حضرت ابوبکرؓ کو نماز پڑھانے کی اجازت دی گئی اور انھوں نے اپنے گھر کے سامنے ایک مسجد بنائی، جب تک کہ وہ سری نماز پڑھتے رہے تو لوگ وہاں جمع نہیں ہوتے، لیکن جب وہ قرأت کرنے لگے اور مرد و عورتیں اور بچے وہاں جمع ہونے لگے۔ پھر وہ رقت کے ساتھ قرآن مجید پڑھنے لگے تو پتھر بھی موم ہونے لگے تھے اور دلوں پر ایسا اثر ہونے لگا کہ قریش کو یہ فکر پڑ گئی کہ کہیں مکہ معظمہ کی زندگی میں تہلکہ نہ پڑ جائے اور زمام کاران کے ہاتھوں سے نہ نکل جائے۔ اصل میں قرآن کا مزاج ہی یہی ہے کہ درد کے ساتھ، ایمانی حلاوت کے ساتھ پڑھا جائے۔ حدیث میں آتا ہے "الایمان یمان والفقه یمان والحکمة یمانیة" یہ میری خوش نصیبی کہ پہلا معلم جو مجھے عطا کیا گیا وہ رقیق القلب تھا، دل درد مند رکھتا تھا اور ہم لوگوں کو حسرت رہتی تھی کہ وہ دیر تک قرآن شریف پڑھیں اور ہم سنیں، وہ ہمارے محلہ کی مسجد میں فجر کی نماز پڑھاتے تھے۔ شاذ و نادر کبھی ایسی نوبت آتی تھی کہ وہ پوری سورہ پڑھ سکیں، پڑھنا شروع کیا کہ گریہ طاری ہوا، آواز بھر آگئی، ان کا معمول تھا، انھوں نے مجھے قرآن مجید کی کچھ سورتیں پڑھائیں، توحید کی سورتیں خاص طور پر انھوں نے مجھے پڑھانی شروع کیں، سورہ زمر سے شروع کیا، پھر وہ وقت آیا کہ زبان و ادب کی تعلیم غالب آگئی اور اسی میں مشغول ہو گیا، لیکن قرآن مجید کا جو نقش تھا وہ وقتاً فوقتاً سامنے آتا تھا اور اثر کرتا تھا۔

اس کے بعد جب میری تعلیم ختم ہوئی تو قرآن مجید کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا، مدارس کے نصاب میں جو کتابیں پڑھی جاتی ہیں، ان سے زیادہ پڑھیں، پھر یہاں لاہور آکر مولانا احمد علیؒ سے قرآن مجید پورا پڑھا، یہاں بھی جس چیز نے متاثر کیا وہ ان کی قرآنی زندگی تھی جس کو قرآن ناطق کہا گیا ہے، اس سے قلب میں جلا محسوس ہوتی تھی، مولانا کی زاہدانہ زندگی، درویشانہ معاشرت اور عمل بالسنت کا مجھ پر وہ اثر پڑا جس کو "برکت" کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، کچھ عرصہ دار العلوم دیوبند میں بھی رہا۔ میں نے مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے وقت مانگا کہ خاص خاص آیات جن میں مجھے اشکال محسوس ہوتا ہے جو عام تفسیروں سے حل نہیں ہوتیں وہ میں آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ مولانا مدنیؒ اپنے زمانہ کے بلند ترین علماء میں

تھے اور علوم وفنون اور حدیث کے علاوہ (جسکے وہ مانے ہوئے استاد اور شیخ تھے) ان کو قرآن مجید کا خاص ذوق تھا اس کا رنگ ان کی زندگی اور مزاج پر چھا گیا تھا۔ انھوں نے مجھے جمعہ کا دن دیا، مجھے یاد ہے کہ ان آیات کو منتخب کر لیتا تھا جو حل نہیں ہوتی تھیں، مولانا کثرت سے سفر کرتے تھے اور وہ تحریک کا زمانہ تھا لیکن مجھے پھر بھی استفادہ کا کچھ موقع ملا۔

مولانا سید سلیمان ندوی اور علوم قرآن

اس کے علاوہ مجھے مولانا سید سلیمان ندویؒ سے قرآن مجید کی بعض آیات کی تفسیر اور بعض آیتوں پر ان کی تقریر سننے کا موقع ملا اور میرا تاثر یہ ہے کہ میں نے قرآن مجید کے بارے میں کسی کا فہم اتنا عمیق نہیں پایا جتنا کہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کا۔ یہ ایک تاریخی انکشاف ہے، لوگ سید صاحب کو مورخ اور سوانح نگار کی حیثیت سے جانتے ہیں، متکلم کی حیثیت سے جانتے ہیں، لیکن میرے نزدیک فہم قرآن میں ان کا پایہ اتنا بلند تھا کہ مجھے ہندوستان ہی نہیں بلکہ تحتی برّ اعظم میں بھی کوئی ایسا شخص نہیں ملا جس کا مطالعۂ قرآن اتنا وسیع اور عمیق ہو اور اس غائر مطالعہ کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان وادب اور بلاغت اور اعجاز قرآنی کا مطالعہ ان کا بہت وسیع وعمیق تھا، پھر مولانا حمید الدین فراہیؒ (جو اس فن کے گویا امام تھے) کی صحبت میں رہ کر انھوں نے ان کی گفتگو، ان کی تحقیقات اور ان کے مطالعۂ قرآن سے پورا استفادہ کیا، مجھے یاد ہے کہ ایک بار ہم لوگ دار المصنفین گئے ہوئے تھے تو انھوں نے سورۂ جمعہ پر تقریر کی، میں نے ایسی عالمانہ، ایسی محققانہ اور ایسی نکات سے بھری ہوئی تقریر ابھی تک نہیں سنی تھی، کاش کہ وہ محفوظ ہو جاتی۔ تو مجھے سید صاحب سے مختصر استفادہ کا موقع ملا، پھر جب دار العلوم ندوۃ العلماء میں بحیثیت استاد میرا انتخاب ہوا تو خاص طور سے قرآن مجید کا درس میرے سپرد ہوا، وہاں قرآن کے درس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو متن قرآن پڑھایا جاتا ہے اور یہ سلسلہ غالباً دار العلوم ندوۃ العلماء ہی سے شروع ہوا، پھر اور مدارس میں اس کی تقلید کی جانے لگی اور یہی صحیح طریقہ ہے کہ ابتدا میں متن کو سامنے رکھ کر پڑھایا جائے بغیر کسی تفسیر کی مداخلت کے

استاد تیار ہو کر آئے اور وہ اپنا مطالعۂ قرآن پیش کرے، تو مجھے کئی سال تک قرآن مجید کی خدمت کا موقع ملا، تفسیر بھی پڑھائی لیکن زیادہ متن قرآن پڑھایا، جو مضامین میرے سپرد ہوئے تھے ان میں سب سے زیادہ اہم تفسیر والا مضمون تھا، میں نے اپنا تعارف اس لئے کرا دیا کہ آپ یہ سمجھیں کہ میں قرآن مجید کا ادنیٰ طالب علم ہوں، اس کے بعد جو کچھ بھی اللہ نے توفیق دی اس میں قرآن مجید کا سب سے بڑا حصہ ہے ع

"آنچہ کردم ہمہ از دولتِ قرآں کردم"

جن لوگوں نے میری ناچیز تحریریں اور تصنیفات دیکھی ہیں ان کو اندازہ ہوگا کہ میری تحریروں کا تانا بانا قرآن مجید ہی سے تیار ہوتا ہے، میں نے سب سے زیادہ قرآن سے مدد لی ہے اور پھر تاریخ سے، اور میں تاریخ کو قرآن مجید کی ہی تفسیر سمجھتا ہوں۔

اجتباء خاص، ہدایت عام

اس وقت جو آیت پڑھی گئی اس آیت میں دو چیزیں بیان ہوئی ہیں، ایک مقامِ اجتباء اور دوسرے ہدایت، اجتباء کے لئے اللہ تعالیٰ نے صاف صاف کہہ دیا ہے "الله یجتبی من رسله من یشاء" سارا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے، جس کو چاہے وہ اجتباء سے سرفراز کرے اور اس کو قبولیت و اجتباء کا درجہ عطا کرے، لیکن ہدایت کی سب انسانوں کو ضرورت ہے۔ "یھدی الیه من ینیب" وہ ان کو ہدایت دیتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتے ہیں، ہدایت کے طالب ہوتے ہیں، اور جن میں انابت کی، تواضع کی اور بندگی کی اور اپنے کو کچھ نہ سمجھنے کی کیفیت پیدا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ ان کو راستہ پر لگا دیتا ہے اور آخر تک پہنچا دیتا ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ اس میں انابت کی صفت پائی جائے "یھدی الیه من ینیب" میں اسی ٹکڑے پر عرض کرنا چاہتا ہوں۔

قرآن مجید کے دو پہلو ہیں، ایک اس کا تعلیمی اور تبلیغی پہلو ہے یعنی وہ عقائد جن پر ہر شخص کو

کو ایمان لانا چاہیئے اور سمجھنا چاہیئے اور قرآن سے اخذ کرنا چاہیئے، اس کے متعلق تو قرآن مجید کا اعلان ہے کہ "بلسان عربی مبین" (روشن اور واضح عربی میں ہے) اس سے زیادہ واضح الفاظ میں بتا دیا "ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر" ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟"

قرآن مجید پڑھ کر انسان مشرک نہیں ہو سکتا

کوئی شخص یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ خدا اس سے کیا چاہتا ہے اور اس کی ہدایت کے لئے کیا شرائط ہیں اور توحید و رسالت اور معاد کا قرآنی تصور کیا ہے؟ قرآنی عقیدہ کیا ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے کہ دنیا میں ہدایت اور آخرت میں نجات مل سکے؟ اس کے لئے قرآن مجید آسان ہے اور کسی کو یہ کہنے کا یہ عذر نہیں کہ ہم قرآن مجید سے ان باتوں کو سمجھ نہیں سکے، اور قرآن ہمارے لئے حجت نہیں، توحید کے بارے میں واضح سے واضح، صریح سے صریح، طاقتور سے طاقتور، دو ٹوک بات جو کہی جا سکتی ہے قرآن مجید میں موجود ہے، قرآن مجید پڑھ کر آدمی سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن مشرک نہیں ہو سکتا۔ میں یہ علی الاعلان کہتا ہوں کہ وہ ٹھوکریں کھا سکتا ہے، بے عمل ہو سکتا ہے، وہ فسق کی راہ اختیار کر سکتا ہے، لیکن جہاں تک توحید و شرک کا تعلق ہے تو قرآن مجید بالکل سورج کی طرح روشن اور سورج کیا چیز ہے اس میں کسی قسم کے اشتباہ کی گنجائش نہیں، اور جہاں تک رسالت کے عقیدہ کا تعلق ہے کہ نبوت کیا چیز ہے؟ انبیاء کیا ہیں؟ ان کے ذمہ کون سی چیز سپرد کی گئی؟ ان کو کیا حکم ہوتا ہے؟ وہ کیا تعلیم دیتے ہیں؟ ان کی سیرت کیسی ہوتی ہے؟ ان کی زندگی کیسی پاکباز اور بلند ہوتی ہے؟ یہ قرآن مجید میں صاف طور سے بیان کر دیا گیا ہے، وہ اپنا تعارف بھی کراتے ہیں، وہ شبہوں کو بھی دور کرتے ہیں، آپ سورۂ اعراف پڑھیئے، سورۂ ہود پڑھیئے، سورۂ شعراء پڑھیئے، اس میں ایک ایک نبی کا نام لے کر تعارف کرایا گیا اور ثبوت دیا گیا ہے۔

عقل جج نہیں بلکہ وکیل ہے

جہاں تک رسالت وانبیاء کا تعلق ہے اس کے بارے میں بھی قرآن مجید میں کسی غلط فہمی کی گنجائش نہیں، لیکن اگر کوئی آدمی گمراہی کا ارادہ ہی کرلے تو گنجائش تو ہر چیز کی ہے، آپ ہی میں سے کوئی صاحب جن کو اللہ تعالیٰ نے ذہانت عطا کی ہو کھڑے ہو جائیں اور کہیں کہ میں ثابت کرسکتا ہوں کہ اس[1] وقت دن ہے سورج روشن ہے اور ہمیں دھوپ کی تمازت محسوس ہو رہی ہے تو یہ ہوسکتا ہے کہ وہ ہم سب کو لاجواب کردیں، اس کا تو زبان اور ذہانت سے تعلق ہے، مقدموں میں عدالتوں میں کیا ہوتا ہے؟ دن کو رات اور رات کو دن ثابت کردیا جاتا ہے۔ ہمارے استاد مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ فرمایا کرتے تھے کہ عقل جج نہیں بلکہ وکیل ہے، اس کو فیس ملنی چاہیئے تو پھر یہ ہر مقدمہ کو ثابت کرسکتی ہے، جب کوئی فلسفہ آیا عقل نے اس کی صداقت کو اس طرح ثابت کیا کہ وہ بالکل بدیہی حقیقت معلوم ہونے لگی، یہ الگ بات ہے کہ کوئی آدمی طے کرلے کہ قرآن مجید سے کوئی بات نکالنا ہے اور اس کی مثال میں آپ کے سامنے دیتا ہوں، میں اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کے ایک جلسہ میں شریک تھا، وہاں ایک صاحب نے مقالہ پڑھا، میں ان کا نام اور جگہ کا نام نہیں لوں گا، انھوں نے اپنے مقالہ میں یہ ثابت کیا کہ قرآن میں جہاں صلوٰۃ کا لفظ آیا ہے، اس سے مراد علاقائی حکومت ہے اور جہاں الصلوٰۃ الوسطیٰ آیا ہے اس سے مراد مرکزی حکومت ہے اور ثابت کیا کہ سارے قرآن میں یہ لفظ اسی معنیٰ میں استعمال ہوا ہے، مجھے اسی وقت بڑی سختی سے اس کی تردید کرنی پڑی۔

ہدایت کے لئے قرآن آسان ہے

ہدایت کے لئے قرآن مجید آسان ہے، اس میں کہیں کوئی شبہ نہیں، لیکن جہاں تک اس کے علوم کا تعلق

---

[1] تقریر شب میں تھی

ہے، اس کے رفیع و دقیق مضامین کا تعلق ہے، اس میں کسی چیز کے متعلق دعوے کے ساتھ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ہم جو کچھ سمجھتے ہیں اس کے علاوہ سب غلط ہے، قرآن کے بارے میں سب سے الگ، منفرد و شاذ رائے قائم کرنا بڑی خطرہ کی بات ہے، حضرت ابوبکر صدیقؓ کا قول ہے "ای سماء تظلنی وای ارض تعلنی اذا قلت فی کتاب اللہ ما لا اعلم" اے اللہ! کس آسمان کے نیچے پناہ لوں گا اور کس زمین پر چلوں گا اگر میں کتاب اللہ کی آیت کے متعلق کوئی ایسی بات کہہ دوں جس کی کوئی بنیاد، کوئی تحقیق نہیں"، اور قرآن کے بارے میں صحابہ کرام کا یہ عام رویہ تھا۔ حضرت عمرؓ خود کسی کے لفظ کے بارے میں فرماتے کہ اس کے کیا معنی؟ اور پھر خود ہی کہہ دیتے کہ "ثکلتک امک یا عمر" عمر تیری ماں تجھ پر روئے، اگر تجھے اس ایک لفظ کے معنی نہیں معلوم تو کیا غضب ہوا، صحابہ کرامؓ کا انداز فکر رہتا ہے کہ پورے قرآن پر حاوی ہونے کو وہ نہ تو ممکن سمجھتے تھے اور نہ ضروری۔ میری یہ جرأت معاف کی جائے اور وہ یہ کہ قرآن کی جو اصل روح، اصل مدعا اور اصل مقصد ہے وہ حاصل ہونا چاہیئے اور اس کے ساتھ معاملہ ہونا چاہیئے ادب و خشوع کا، ہمیں بہت سی چیزوں کی حقیقتیں معلوم نہ ہونے کے باوجود ان سے پورا پورا فائدہ پہنچا ہے، اگر کسی شخص کو قرآن مجید کے حقائق و مطالب معلوم نہیں یہاں تک کہ پورے الفاظ کے معنی بھی معلوم نہیں، لیکن اس کے دل میں خدا کا خوف ہے، خشیت ہے، جب قرآن پڑھا جاتا ہے تو یہ حالت ہوتی ہے جو اللہ نے فرمائی "لو انزلنا ھٰذا القرآن علی جبل لرأیتہ خاشعا متصدعا من خشیۃ اللہ" اس کا حال یہ ہے کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، وہ لرز جاتا ہے اور اس کا رواں رواں لرزجاتا ہے، کہتا ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے، یہ میرے رب کا کلام ہے، تو ہو سکتا ہے کہ وہ ہدایت کے آخری مدارج تک پہنچ جائے اور اس کو قرب بالقرآن حاصل ہو، احادیث میں آتا ہے کچھ لوگ ایسے پیدا ہوں گے کہ قرآن مجید پڑھیں گے اور بہت تکلف سے پڑھیں گے، مگر ان کے حلق سے نہیں اترے گا، تو جہاں تک مضامین کا تعلق ہے میں ایک طالب علم کی حیثیت سے عرض کرتا ہوں کہ وہ ایک ایسا سمندر ہے جس کی کوئی انتہا نہیں اور بڑے سے بڑا آدمی اس کی وسعت کے سامنے لرزہ براندام رہتا تھا اور سمجھتا تھا کہ اللہ کی ہدایت اور توفیق کے بغیر وہ ایک

قدم نہیں چل سکتا۔

افادہ اللہ کی طرف سے

پہلی بات تو یہ سمجھیے کہ افادہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے اور یہ افادہ ہوتا ہے ان قلوب پر جو اللہ کی خشیت سے اور کلامِ ربانی کی ہیبت سے اور اس کے جلال سے معمور ہوتے ہیں، ان پر اللہ کی طرف سے علوم کا ورود ہوتا ہے، دوسری بات یہ کہ قرآن مجید کو نوافل میں پڑھے اور یہ تصور کرے کہ جیسے قلب پر اسی وقت نزول ہو رہا ہے اور اس کا لطف لے اور اس میں گم ہو جانے کی کوشش کرے۔ قرآن مجید دماغی زور آزمائی کی چیز نہیں ہے کہ اپنا پسندیدہ مطلب قرآن مجید سے زور آزمائی کر کے نکالا جائے۔

تیسری بات یہ کہ دورانِ مطالعہ جو مطلب و معانی سمجھ میں آئیں تو یہ کہے کہ میری ناقص سمجھ میں یہ بات آئی ہے، ایسا سمجھ میں آتا ہے اور یہ دعویٰ ہرگز نہ کرے کہ آج تک قرآن کو کسی نے سمجھا نہیں، میں نے ہی سمجھا ہے، یہ بالکل صحیح نہیں ہے، اور میں نے بارہا کہا اور لکھا بھی ہے کہ اگر قرآن مجید اپنے کو تیرہ سو برس میں نہیں سمجھا سکا تو یہ قرآن مجید پر بہت بڑا الزام ہے۔ وہ تو کہتا ہے "لسان عربی مبین" انا انزلناہ قرآناً عربیاً لعلکم تعقلون" اور آپ کہتے ہیں کہ ایک ہزار برس تک، بارہ سو برس تک قرآن مجید کے فلاں لفظ کی حقیقت آج تک کسی نے سمجھی نہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کا افادہ اتنے دنوں تک بند رہا۔ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کے ایک سیمنار میں اس کی اختتامی تقریر میں، میں نے کہا تھا کہ اہلِ علم اپنی کسی تحقیق کو یہ کہہ کر پیش کرتے ہیں کہ ہمیں مطالعہ کا جتنا موقع ملا، اس کے نتیجہ میں ہمارا خیال یہ ہے ..... میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں ... لیکن یہ طریقہ کہ کوئی شخص اپنے نتائجِ فکر کو سو فیصد صحیح ثابت کرنے پر اصرار کرے اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے سب کو غلط قرار دے صحیح نہیں۔ قرآن مجید کے سلسلہ میں آتا ہے کہ اس کا نیا پن، تازگی پرانی نہیں ہوگی اور اس کے عجائب کی کوئی انتہا نہیں تو اگر آپ کو عمرِ نوح بھی ملے اور وہ قرآن مجید کے تدبر میں صرف ہو تو برروز نئے نئے معانی کھلنے لگیں۔ ہماری عمر کا یہ محدود وقت، محدود قوت اور صلاحیت اور

اس کے بعد ہمارا یہ دعویٰ کہ قرآن مجید اب تک سمجھا ہی نہیں گیا، یہ بہت بڑی غلطی ہے۔

میری ذاتی کتاب

آخری بات یہ ہے کہ قرآن مجید کو اپنی کتاب سمجھا جائے، یہ کتابِ ہدایت ہے، یہ کتاب ابدی ہے، کتاب آسمانی ہے لیکن میری ذاتی کتاب بھی ہے، میرا ذاتی ہدایت نامہ بھی ہے، اس میں میری ذاتی کمزوریاں بیان کی گئی ہیں، میرے ذاتی امراض کی نشاندہی کی گئی ہے۔

قرآن مجید میں ہر آدمی اپنے کو تلاش کر سکتا ہے، یہ جب ہو گا جب کہ آپ اس کو زندہ کتاب سمجھیں یا اپنی کتاب سمجھیں، اور آپ میں اپنی اصلاح کا جذبہ ہو، لوگوں کی اصلاح تو بعد میں ہو گی پہلے اپنی اصلاح ہو جائے۔

انبیاء کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے میری ہدایت ہو جائے پھر میں دوسروں سے کچھ کہوں، ہم میں سے بہت سے لوگ قرآن مجید کو اس لئے پڑھتے ہیں کہ یہ حجت بنے، دوسروں کو شرمندہ کیا جائے، دوسروں پر حجت قائم کی جائے، حالانکہ صحابہ کرامؓ قرآن پڑھتے تھے اپنی اصلاح کے لئے۔ ایک آیت پڑھی اس پر عمل کرنا شروع کیا۔ سورۂ بقرہ بعض اوقات مہینوں میں ختم ہوئی۔

یہ چند باتیں ایک طالب علم کی حیثیت سے میرے ذہن میں تھیں وہ سب میں نے آپ کے سامنے رکھ دیں۔ "یھدی الیہ من ینیب" کے میدان میں جہاں تک ہم کوشش کر سکتے ہیں کریں اللہ جسکو چاہے تمام اجتہاد تک پہنچائے ہم اس کے مکلف نہیں ہیں، ہم سیکھنا چاہیں، ہم ہدایت حاصل کرنا چاہیں، ہم بننا چاہیں اور اپنی زندگی میں انقلاب لانا چاہیں تو قرآن مجید موجود ہے جو ہماری رہنمائی بھی کرے گا اور منزلِ مقصود پر بھی پہنچائے گا، ہم میں ہدایت کی طلب اپنی احتیاج کا احساس اور اپنی بے بضاعتی کا اعتراف ہونا چاہیئے۔ اسی کے مجموعہ کا نام انابت ہے۔ میں دعا کرتا ہوں، آپ بھی دعا کریں۔

اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیہم غیر المغضوب علیہم ولا الضالین۔

علومِ دینیہ کے طلبہ و فضلاء کی کامیابی کی تین لازوال شرطیں

یہ تقریر ۱۲ جولائی ۱۹۷۸ء کو دارالعلوم کورنگی کراچی میں علماء، اساتذۂ دارالعلوم اور طلبہ کے سامنے کی گئی، مقرر کا تعارف حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ بانی دارالعلوم کے فرزند گرامی مولانا محمد تقی عثمانی رکن اسلامی نظریاتی کونسل نے کرایا۔

مفتی محمد شفیع صاحبؒ اور پاکستان کے علمائے کبار کی یاد

خطبۂ مسنونہ!

حضرات اساتذۂ دارالعلوم اور عزیز طلبہ

میں اس دور کے جن علماء کے رسوخ فی العلم اور تبحر کا معتقد و قائل ہوں، ان میں اس دارالعلوم کے بانی حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا خاص مقام ہے۔ علمی تبحر، فقہ و فتاویٰ پر وسیع اور گہری نظر، قوتِ تدریس یہ سب چیزیں بھی قابلِ قدر اور قابلِ احترام اوصاف و کمالات ہیں، لیکن ایک دوسری چیز ہے جس کی بنا پر کسی فقیہ و مفتی کو "فقیہ النفس" کہتے ہیں، یہ امتیاز علمائے زمانہ میں حضرت مفتی صاحبؒ کو حاصل تھا، وہ میرے اساتذہ کی عمر اور صف کے بزرگ تھے، یہ میری بدقسمتی ہے کہ مجھے براہِ راست ان سے درسی طور پر استفادہ کا موقع نہیں ملا۔ جب میں دیوبند پہنچا تو حضرت مفتی صاحب وہاں درس دیتے تھے، لیکن میں چونکہ صرف دورہ کے اسباق میں شریک ہوتا تھا اس لئے مجھے ان سے تلمذ کا شرف حاصل نہ ہوا۔ میں نے بائیس۲۲ برس کے بعد اس سرزمین پر قدم رکھا ہے۔ ۱۹۵۶ء میں ایک بیرونی سفر سے

آتے ہوئے دو تین دن کے لئے کراچی ٹھہرا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آج اس نے ان کی اس بہترین یادگار دارالعلوم میں پہنچایا۔

اس وقت پاکستان کو حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب، مولانا محمد یوسف صاحب بنوری جیسے راسخ فی العلم والدین علماء کی ضرورت تھی۔ واقعہ تو یہ ہے کہ حالات و مسائل ایسے ہیں کہ اس وقت اس ملک اور اس عہد کو حجۃ الاسلام غزالیؒ، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور حکیم الاسلام شاہ ولی اللہؒ کی ضرورت تھی، لیکن اگر اس پایہ کے علماء اور دینی رہنما نہ ہوتے تو کم سے کم ان حضرات کے پایہ کے علماء تو ہوتے جن کا میں نے ذکر کیا، مگر افسوس کہ اس وقت وہ بھی ہم میں موجود نہیں۔

انقلابِ زمانہ کا شکوہ

عزیز طلبہ چونکہ میں اس وقت دارالعلوم میں خطاب کر رہا ہوں اس لئے جو کچھ کہوں گا وہ علم کے تعلق سے کہونگا اور طلبہ و اساتذہ کے مستقبل، ان کے فرائض، ذمہ داریوں، وقت کی نزاکت اور زمانہ کے فتنوں کے متعلق عرض کرونگا۔

آپ کے کان میں بار بار یہ بات پڑی ہوگی کہ زمانہ بدل گیا ہے، دنیا بدل گئی ہے، زمین آسمان بدل گئے ہیں، سوچنے کے طور طریقے بدل گئے ہیں، اس زمانہ میں علومِ دینیہ کی تحصیل میں عمر صرف کرنا، ان میں کمال پیدا کرنا، ان کے دقائق اور جزئیات میں جانا، ایک بے وقت کی شہنائی اور "کوہ کندن و کاہ برآوردن" نہیں تو کیا ہے؟

صرف یہی زمانہ نہیں بلکہ ہر زمانہ میں زمانہ کی تبدیلی کا شکوہ کیا گیا ہے۔ آپ کسی زمانہ کے ادب و شاعری یا تاریخ کا مطالعہ کریں، آپ کو ہر جگہ نظر آئے گا کہ یہی رونا رویا گیا ہے کہ زمانہ بڑا خراب ہے، علم کی قدر نہیں، اہلِ کمال کی قدر نہیں، بے کمالی اور بے کمالوں کا دور دورہ ہے۔ عربی شاعری اور ادب کو دیکھیں گے تو ابوالعلاء معری کو کہتے ہوئے سنیں گے:

تطاولت الارضُ السماءَ سفاھۃ

وفاخرت الشُّھبَ الحصا والجنادل

وقال السُّها للشمس انتِ ضئیلةٌ

وقال الدُّجیٰ للصّبح لونکَ حائل

اذا نسب الطّائیَ بالبخل مادرٌ

وعَیّرَ قُسًّا بالفهامة باقل

آخر میں کہتا ہے:

فیا موتُ زُرْ اِنَّ الحیاةَ ذمیمةٌ

و یا نفس جِدّی ان دھرکِ ھازلٌ

یعنی اے موت تیرا آجانا ہی اچھا ہے، اس لئے کہ زندگی کا کوئی مزا نہیں رہا اور اے نفس تو ہی سنجیدگی اور وقار کے راستہ پر چل، تیرا زمانہ تو دل لگی اور مذاق کر رہا ہے۔

دوسری طرف حافظ شیرازی اس طرح شکوہ سنج ہیں ؎

ایں چہ شوریست کہ در دورِ قمر می بینم

ہمہ آفاق پُر از فتنہ و شر می بینم

آگے زمانہ اور اہلِ زمانہ کی سفلہ پروری و ناقدری کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں ؎

اسپ تازی شدہ مجروح بزیرِ پالاں

طوقِ زرّیں ہمہ در گردنِ خر می بینم

اردو کی طرف آئیے گا تو آپ کو آبِ حیات اور دوسرے تذکروں میں شہرِ آشوب ملیں گے، جن میں شعراء نے اپنے زمانہ اور اپنے ملک کی خستہ حالت اور انقلابِ روزگار پر آنسو بہائے ہیں۔ اس سلسلہ میں استاد ذوقؔ کا ایک ہی شعر کافی ہے ؎

پھرتے ہیں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

یہ چند اشعار ہیں جو مجھے اس وقت برجستہ یاد آئے ورنہ ایسے اشعار اور زمانہ کے شکوہ شکایت سے دیوان کے دیوان بھرے ہوئے نظر آئیں گے۔ جو کتاب دیکھئے گا زمانہ کا ماتم ہوگا اور شکوہ کا دفتر، اپنی جنس کمال کس کے سامنے پیش کی جائے، جوہری کہاں ہیں، اہل نظر کہاں ہیں؟ یہ بے کمالی اور بے ہنری کا دور ہے۔ کس کے لئے انسان محنت کرے، کس کے لئے اپنا پتا پانی کرے، کس کے لئے اپنا خونِ جگر بہائے؟ اگر آپ ان باتوں پر اعتبار کرلیں گے تو آپ کا نہ مدرسہ میں جی لگے گا، نہ پڑھنے میں، نہ محنت کرنے میں۔

سننِ الٰہیہ ناقابلِ تبدیل ہیں

میں آپ سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ زمانہ کا انقلاب ایک حقیقت ہے، اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا، سو برس پہلے کا زمانہ دیکھئے کیا خیر و برکت کا زمانہ تھا، خواص تو خواص اُس وقت کے عوام بھی اِس زمانہ کے خواص سے بہتر تھے، کیا قوتِ ایمانی تھی، کیا دینی حمیت و غیرت تھی، دین کا علم، قرآن کا حفظ، مرد تو مرد عورتوں میں کتنا عام تھا۔ اِس وقت غفلت و مادیت کا دور دورہ ہے، دین و علمِ دین کے محرکات و دواعی بہت کمزور پڑ گئے ہیں، لیکن میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ان تمام انقلابات کے باوجود جو پہلے ہو چکے اور ان تمام انقلابات کے باوجود جو اب ہو رہے ہیں اور ہوں گے، اور جن کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اللہ تعالیٰ کی سنن ناقابل تبدیل ہیں، اور ان پر ان انقلابات کوئی اثر نہیں جہاں اس حقیقت کا قرآن مجید میں اعلان فرمایا گیا ہے، وہاں اس کو قرآن مجید کے عام اسلوب کے خلاف زور دینے کے لئے دہرایا گیا ہے اور مکرّر فرمایا گیا ہے، "ولن تجد لسنة الله تبديلا، ولن تجد لسنة الله تحويلا" اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ اور علمِ کامل کی بنا پر اس کائنات اور فطرتِ انسانی کے متعلق جو آئین و قوانین بنا دیئے ہیں اور جو اصول طے کر دیئے ہیں ان میں قیامت تک کوئی تبدیلی نہیں ہوگی، اب یہ قرآن مجید کے استقراء اور حدیث و سنت کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ قوانین کیا ہیں؟ ان قوانین کی فہرست بہت طویل ہے اور مجھ جیسے طالب علم کے بس میں نہیں ہے کہ وہ پوری فہرست مرتب کر سکے، نہ وقت میں اس کی گنجائش ہے، لیکن میں اپنے علمِ ناقص کی بنا پر ان سنن کو ذہن میں

سے تین سنتوں کا ذکر کروں گا جن کا ہماری زندگی اور ہمارے مدارس و مقاصد سے خاص تعلق ہے۔

نافعیت کا احترام و اعتراف

ان میں سے ایک سنت اللہ لوگوں کا نافعیت و افادیت کے سامنے جھکنا، اس کی قدر کرنا اور اس کو تسلیم کرنا ہے، نافعیت اور اس کے محل و مرکز کے ساتھ محبت کا ہونا، "نافع" کو تلاش کرنا، اس کی طرف رجوع کرنا اور وہ مل جائے تو اس کی قدر کرنا انسانی فطرت میں داخل ہے، نافعیت کی بقا اور اس کی زندگی اور سرسبزی کی اللہ تعالیٰ نے ضمانت کی ہے، اور جو اس سے خالی ہے اس کے لئے یہ ضمانت نہیں، سورۂ رعد میں صاف فرمایا گیا:

فاما الزبد فیذھب جفاء	سو جھاگ تو سوکھ کر زائل ہو جاتا ہے اور (پانی)
و اما ما ینفع الناس فیمکث	جو لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے وہ زمین میں ٹھہرا رہتا
فی الارض کذلک یضرب	ہے اسی طرح خدا (صحیح اور غلط کی) مثالیں بیان
اللہ الامثال	فرماتا ہے (تاکہ تم سمجھو)

"بقائے اصلح" نہیں بلکہ قرآنی زبان و اصطلاح میں "بقائے انفع" کا یہ قانون ہزاروں لاکھوں برس سے چل رہا ہے، اور ہزار تبدیلیوں کے باوجود چلتا رہے گا، نافعیت کے لئے پنپنا، پھلنا پھولنا اور اپنی قیمت اور اہمیت تسلیم کرا لینا مقدر ہو چکا ہے۔ نافع بن جانا ہزار مخالفتوں اور فتنوں سے حفاظت کا ذریعہ ہے، اس کے لئے پروپیگنڈہ اور پبلسٹی کی ضرورت نہیں، نافع کے اندر محبوبیت کی صفت ہے، اس میں رنگ و مذہب اور قوم و وطن کی بھی تفریق نہیں، "نافع" اگر پہاڑ کی چوٹی پر بھی جا کر بیٹھ جائے گا تو دنیا اس کو تلاش کرنے کے لئے وہاں پہنچے گی، اور اس کو ہاتھوں ہاتھ سر پر بٹھا کر بلکہ آنکھوں میں جگہ دے کر لائے گی، یہ اللہ کی سنت ہے جو ہزاروں لاکھوں برس سے چلی آرہی ہے۔

نافع کی تلاش وطلب

عزیز طلبہ! آپ اپنے اندر نافعیت پیدا کرنے کی کوشش کیجئے، آپ سے زندگی کی شبِ تاریک میں راہ رؤں کو روشنی اور رہنمائی ملتی ہو، آپ کی مدد سے علمی عقدے حل ہوتے ہوں، آپ کی صحبت میں بیٹھ کر ایمان میں طاقت پیدا ہوتی ہو، آپ کے پاس جاکر آدمی کچھ لے کر آتا ہو، اس کے بعد اگر آپ اپنے اور لوگوں کے درمیان دیواریں کھڑی کر دیجئے، اپنے مکان کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جائیے، لوگوں کو اگر یہ معلوم ہوگا کہ یہاں ایک "نافع" رہتا ہے، اس سے فلاں قسم کا فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے (روح کا فائدہ اور ایمان کا فائدہ تو بہت بڑی چیز ہے) تو لوگ دیواریں پھاند کر اور دروازہ توڑ کر آپ کے پاس پہنچ جائیں گے۔

اس موقع پر مجھے حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی بھوپالیؒ کی ایک حکایت یاد آئی، اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑے بڑے حقائق کو آسان وعام فہم تمثیلوں میں بیان کرنے کی بڑی حکمت عطا فرمائی تھی۔ ان سے ایک مرتبہ نواب صاحب کوروائی نے شکایت کی کہ حضرت میں نے بڑے شوق سے ایک مسجد بنوائی، اس پر بڑا روپیہ خرچ کیا، لیکن وہاں کوئی نماز پڑھنے نہیں آتا، حضرت کے سمجھانے کا عجیب طریقہ تھا، بعض مرتبہ وہ امتحان بن جاتا، فرمانے لگے کہ نواب صاحب! اس کا دروازہ چن دیجئے اور بالکل تیغہ کر دیجئے، نواب صاحب کو بڑی حیرت ہوئی کہ حضرت اُلٹا علاج بتا رہے ہیں، کہنے لگے کہ حضرت میں نے تو مسجد اس لئے بنوائی ہے کہ لوگ آئیں اور نماز پڑھیں اور وہ آباد ہو، آپ فرماتے ہیں کہ اس کا دروازہ چن دیا جائے، حضرت نے فرمایا کہ ابھی میری بات تو پوری نہیں ہوئی دروازہ چن دیجئے اور اندر ایک آدمی کو بٹھا دیجئے جس کے ہاتھ میں پچاس پچاس کے نوٹ ہوں یا دس، دس، پانچ پانچ ہی کے نوٹ ہوں اور باہر اعلان کرا دیجئے کہ اس مسجد میں نوٹ تقسیم ہو رہے ہیں، آپ نے مسجد تو بنا ڈالی لیکن نماز کا جو ثواب اور فائدہ ہے وہ لوگوں کو معلوم نہیں، اب مسجد میں کیسے آئیں؟ ان کو نوٹ کا فائدہ معلوم ہے ان کو معلوم ہے کہ پانچ روپیہ کے نوٹ سے کیا کیا چیزیں خریدی جاسکتی ہیں اور اس سے کیا کیا کام نکالے جاسکتے ہیں، ان کو یہ معلوم نہیں

کہ نماز سے کیا کیا چیزیں خریدی جا سکتی ہیں اور اس سے کیا کیا فوائد حاصل کئے جا سکتے ہیں، اب آپ ان سے توقع کرتے ہیں کہ وہ گرمی یا سردی میں تکلیف اٹھا کر، اپنا حرج کر کے اور دور سے چل کر کے آئیں گے، آدمی بٹھانے کے بعد کچھ ڈھنڈورا پٹوانے کی بھی ضرورت نہیں، ذرا سی دیر میں یہ بات کھیل جائے گی کہ نواب صاحب نے خدا جانے کس بنا پہ یہ کام کیا ہے کہ مسجد کے دروازے تو چن دیئے ہیں اور اندر ایک آدمی ہزار روپئے کے نوٹ لئے بیٹھا ہے اور تقسیم کر رہا ہے، نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ دروازہ توڑ کر مسجد میں داخل ہو جائیں گے اور کوئی ہزار روکے گا وہ رکیں گے نہیں، تو نافعیت ہی اصل چیز ہے جس پر لوگ پروانہ وار ہجوم کرتے ہیں، پروانوں کو بتانے کی ضرورت نہیں کہ شمع جل رہی ہے، کون یہ اعلان کرتا ہے کہ پروانو! شمع پر ہجوم کرو، ان پروانوں اور شمع کے درمیان کیا رابطہ ہے؟ جہاں پانی کا چشمہ ہوتا ہے وہاں مور و ملخ، انسان و چوپائے جمع ہو جاتے ہیں۔ انقلاب کا شکوہ بے خبری، بے بصری اور کم ہمتی کی دلیل ہے۔

نافعیت کی قوتِ تسخیر

آپ کو ایک لطیفہ سناتا ہوں، ہمارے شہر لکھنؤ میں ایک چوٹی کے مسلمان ڈاکٹر عبد الحمید صاحب مرحوم جن کی حذاقت، وسیع تجربہ اور استادی کا ہندو مسلمان سبھی ڈاکٹر لوہا مانتے تھے، انھوں نے مجھے لطیفہ سنایا کہ بارہ بنکی کے ایک غیر مسلم سرمایہ دار اور کاروباری شخص نے تقسیم کے بعد ایک دن ان سے طنزاً کہا کہ ڈاکٹر صاحب آپ پاکستان نہیں گئے؟ انھوں نے کہا کہ ہاں میں نے ہندوستان ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے، خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ وہ تاجر کسی سخت مرض میں مبتلا ہوا، ہر طرح کے علاج اس نے کئے، بڑے بڑے ڈاکٹروں کو بلایا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ ہار کر اس نے ڈاکٹر صاحب کو تکلیف دی۔ ڈاکٹر صاحب جب اس کو دیکھنے گئے اور علاج شروع کیا تو کہا کہ دیکھئے۔ اگر میں پاکستان چلا جاتا تو آپ مجھے کہاں بلاتے اور میں آپ کی خدمت کیسے کر سکتا۔ اللہ کا کرنا کہ انھیں کے علاج سے اس کو فائدہ ہوا اور اس کو شرمندہ ہونا پڑا۔

میں آپ کی ہزار مشکلات کا حل یہ سمجھتا ہوں کہ آپ اپنے زمانہ سے اپنا نافع اور مفید ہونا تسلیم کرالیجئے آپ اس سے یہ اقرار کرا لیجئے کہ آپ کے پاس جو علم ہے وہ دنیا کے پاس نہیں ہے' دنیا کا قاعدہ یہی ہے کہ جو سودا جس دوکان پر ملتا ہے آدمی اس کی خریداری کے لئے وہیں جاتا ہے، ایک صاحب کمال بھی اس دوسرے صاحبِ کمال کی طرف رجوع کرتا ہے جس کے پاس اپنے دل کا مدعا اور اپنے مرض کی دوا پاتا ہے، امام احمد بن حنبلؒ حدیث و فقہ میں اپنے زمانہ کے امام اور بغداد میں مرجع خلائق تھے لیکن اپنے قلب کو غذا اور روح کو تقویت پہنچانے کے لئے اپنے شہر کے ایک ایسے صاحبِ دل بزرگ کے حلقۂ صحبت میں تشریف لے جاتے تھے جن کو علم میں ان سے کوئی نسبت نہ تھی۔ ایک مرتبہ ان کے ایک صاحبزادے نے ان سے کہا، ابا جان! آپ کے وہاں جانے سے ہم لوگوں کا سر نیچا ہو جاتا ہے کہ لوگ کیا کہیں گے، فرمایا کہ بیٹے! انسان جہاں اپنا فائدہ دیکھتا ہے وہاں جاتا ہے، مجھے وہاں اپنے دل کا فائدہ نظر آتا ہے"۔

یہ درسِ نظامی جو آج ساری دنیا میں سکّہ کی طرح چل رہا ہے، ملا نظام الدین فرنگی محلی کا مرتب کیا ہوا ہے جو استاذ الہند اور استاذ العلماء تھے۔ وہ بایں علم و فضل اودھ کے ایک قصبہ بانسہ کے ایک بزرگ حضرت سید عبدالرزاق بانسوی قادریؒ کے مرید تھے جو اودھ کی پوربی زبان بولتے تھے اور انھوں نے کچھ ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں۔ ملا صاحب نے حضرت کے ملفوظات بھی لکھے ہیں اور بڑی محبت و عقیدت سے ان کا نام لیتے ہیں، اس لئے کہ ان کو اپنے سارے علم و فضل کے باوجود اپنے اندر ایک خلا محسوس ہوتا تھا جو وہاں جا کر پر ہوتا تھا، وہ سب کے استاد تھے لیکن ان کو ایسے آدمی کی تلاش تھی جہاں جا کر یہ معلوم ہو کہ میں کچھ نہیں ہوں اور ابھی سیکھنے اور پڑھنے کی ضرورت ہے، حضرت مولانا عبدالحی بڈھانویؒ اور حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ جن میں سے اول الذکر کو شاہ عبدالعزیز صاحبؒ شیخ الاسلام اور ثانی الذکر کو حجۃ الاسلام کے لقب سے یاد کرتے ہیں، حضرت سید احمد شہیدؒ کے دست گرفتہ اور ان کے دامن سے وابستہ تھے جن کی تعلیم کی تکمیل بھی نہیں ہوئی تھی۔ دیوبند کے بزرگوں نے بیان کیا ہے کہ جب سید صاحب یہاں تشریف لائے تو دونوں بزرگوں کا حال یہ تھا کہ سید صاحب آرام فرماتے ہوتے تھے اور دونوں حضرات چارپائی کے

دائیں بائیں بیٹھے ہوتے، سید صاحب بیدار ہوتے اور کچھ فرماتے تو یہ حضرات دیر تک اس کا مذاکرہ کرتے اور لطف لیتے۔

استغناء و بے غرضی کی طاقت و تاثیر

دوسری صفت استغناء اور بے غرضی ہے، اللہ تعالیٰ کی یہ بھی سنت ہے کہ جو مانگے لوگ اس سے گھبرائیں اور جو دامن پھیلائے اس سے بھاگیں اور جو اپنی مٹھی بند کر لے اور دامن سمیٹ لے اس کے قدموں میں پڑیں اور خوشامد کریں کہ وہ کچھ قبول کر لے، استغناء میں ازل سے محبوبیت و مقبولیت ہے اور طلب میں ذلت، گویا مستغنی سے احتیاج کا معاملہ ہے، اور طالب سے استغناء کا، یہ بھی ایک ایسی سنتِ خداوندی ہے جس میں زمانہ کی تبدیلی کے باوجود کوئی تبدیلی نہیں، چوتھی صدی کے حالات آپ پڑھیں تو یہی نظر آئے گا، آٹھویں صدی کے پڑھیں گے تو اسی طرح کے واقعات ملیں گے اور چودھویں صدی میں بھی یہی ہو رہا ہے۔ میں اس کے زیادہ واقعات نہیں بیان کرتا اور تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا کہ بزرگانِ دین کے تذکرے اور تصوف کی تاریخ اس سے بھری پڑی ہے اور آپ کو خود بھی اس کے تجربے ہوتے ہوں گے، نہیں تو اپنے اساتذہ اور بزرگوں سے ان کے اساتذہ و بزرگوں کے واقعات سنے ہوں گے۔

کسب کمال کن کہ عزیزِ جہاں شوی

تیسری اور آخری خصوصیت کمال، امتیاز اور کسی چیز میں مہارتِ تامہ ہے۔ علومِ عالیہ تو بڑی چیز ہیں علومِ آلیہ میں بھی اگر کسی فن میں کمال پیدا ہو جائے اور اس سے بھی نیچے اتر کر اگر کسی کو خطاطی، وراقی میں کمال حاصل ہو تو اچھے اچھے اہلِ علم اس کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں، بڑے بڑے مصنفین، بڑے بڑے ناشر کاتبوں کی نازبرداری کرتے ہیں، ان کے نخرے سہتے ہیں، ان کی خوشامد کرتے ہیں کہ وہ وقت پر لکھ دیں کم سے کم کتاب کا نام ہی لکھ دیں جس کا بلاک بنایا جا سکے۔

آپ اگر کسی صاحبِ کمال کو یا علم کے کسی ماہرِ خصوصی کو دیکھتے ہیں یا اس کے متعلق سنتے ہیں کہ وہ عسرت و بیکاری کی زندگی گزار رہے ہیں تو آپ یہ سمجھ لیجیے کہ اس صاحبِ کمال کے ساتھ کوئی ایسی کمزوری یا مزاجی خرابی لگی ہوئی ہے جس نے اس کے سارے کمالات پر پردہ ڈال دیا ہے، مثلاً غصہ بہت ہے، مزاج میں تلوّن ہے، کاہلی ہے، محنت نہیں ہوتی، پڑھانے میں جی نہیں لگتا، بے ضابطگی کی عادت پڑ گئی ہے، کسی کی کوئی بات برداشت نہیں ہوتی، اس سے آگے بڑھ کر کچھ مراق ہے، سنک ہے، کسی جگہ ٹھہر نے نہیں پاتے، فوراً ان بن ہو جاتی ہے، ایسی کوئی نہ کوئی بات آپ ضرور پائیں گے جس کی وجہ سے ان کے کمال اور علم سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکا اور گوشۂ گمنامی یا کس مپرسی میں دن گزار رہے ہیں۔

یہ وہ تین لازوال شرطیں اور صفتیں ہیں جن کے ساتھ سنت اللہ یہ ہے کہ زمانہ کتنا ہی بدل جائے اور اہلِ زمانہ کتنے ہی بگڑ جائیں ان کے اندر تسخیر کا مادہ اور محبوبیت کی صفت ہے اور آج ہمارے فضلاءِ مدارس اور طلبۂ علومِ دینیہ کو انھیں شرطوں کو پورا کرنے اور انھیں صفات سے متصف ہونے کی ضرورت ہے۔

یہ دین زندہ ہے اور زندوں سے قائم ہے

یہ تقریر مدرسہ عربیہ نیوٹاؤن کراچی میں ۱۳ر جولائی ۱۹۷۸ء کو طلبہ کے سامنے کی گئی جس میں دارالعلوم کے اساتذہ، طلبہ، اراکینِ انتظامیہ کے علاوہ ملک کے مختلف علاقوں کے علماء اور تعلیمیافتہ حضرات نیز بیرونِ ملک کے ان مندوبین کی بھی معتدبہ تعداد شریک تھی جو اسلامی ایشیائی کانفرنس میں شرکت کے لئے تشریف لائے تھے۔

خطبۂ مسنونہ!

عزیز طلبہ اور حاضرین مجلس!

دین کو زندہ اشخاص کی ضرورت ہے

اس دین کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ اصول مقرر اور مقدر کردیا ہے کہ اس کے لئے زندہ اشخاص برابر پیدا ہوتے رہیں گے۔ کوئی درخت اس وقت تک سرسبز و شاداب اور زندہ درخت نہیں سمجھا جاتا جب تک کہ وہ باثمر نہ ہو۔ اس میں نئی نئی پتیاں اور نئے نئے شگوفے نہ کھلتے رہتے ہوں۔ یہ دین زندہ ہے اور زندہ انسانوں کے لئے ہے اور اس کو زندہ اشخاص کی ضرورت ہے، وہ دین مٹ گئے، ختم ہوگئے، جنھوں نے روحانیت کے میدان میں، علم کے میدان میں، فکر کے میدان میں، قیادت کے میدان میں زندہ اشخاص پیدا کرنے بند کردیئے، انسان زندہ اشخاص سے متاثر ہوتا ہے، چراغ سے چراغ جلتا رہا ہے اور چراغ سے چراغ جلنا چاہیئے اور جلتے رہنا چاہیئے۔

اور اگر اس امت کو باقی رہنا ہے تو اس امت کے لئے ضروری ہے کہ وہ زندہ اشخاص پیدا کرے، اس کا درخت علم، اس کا درختِ فکر، اس کا درختِ اصلاح اور اس کا درختِ روحانیت نئے نئے برگ و بار لاتا رہے، نئے نئے شگوفے کھلاتا رہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ میری امت بارانِ رحمت کی طرح ہے، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کے ابتدائی قطرے مردہ زمین کے لئے زیادہ حیات بخش ہیں یا بعد کے۔

میں تاریخ لکھتا رہا ہوں، میرے شعور اور تصنیف و تالیف کی عمر زیادہ تر اسی کوچہ میں گزری اور میں کہہ سکتا ہوں

ع عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

میں اب بھی اس پر عقیدہ رکھتا ہوں کہ اسلاف کے کارنامے، اسلاف کا خلوص و صداقت، اسلاف کا تعلق مع اللہ اسلاف کی استقامت اور اسلاف کی قربانیاں بعد کی نسلوں کے لئے بہترین سرمایہ ہیں اور وہ حیات و زندگی کا پیغام دینے والی ہیں، ہم نے ہمیشہ کہا اور مانا کہ ہمارے بزرگ ایسے تھے، ان کا حافظہ اتنا قوی تھا، ان کا علم اتنا وسیع تھا، وہ ایسے متبحر عالم تھے، یہ سب سر آنکھوں پر لیکن اتنا کافی نہیں۔

فیض مُردوں سے بھی حاصل ہو سکتا ہے مگر رہنمائی زندوں ہی سے حاصل ہوتی ہے

جس ادارہ اور مکتب خیال سے میرا تعلق ہے اس نے تاریخِ اسلام کو مرتب کیا، اس کمتی برِ اعظم (ہند) میں جس ادارہ نے اردو میں تاریخِ اسلام مرتب کرنے کی سب سے پہلے سعادت حاصل کی ہے اس سے میرا تعلق ہے، یعنی "دارالعلوم ندوۃ العلماء" اور "دارالمصنفین" کسی اور کی زبان سے تو شاید آپ سوچیں کہ یہ تاریخ سے ناواقف ہے اور تاریخ سے انصاف نہیں کرتا، میری زبان سے سنئے کہ اسلاف نے جو کچھ کیا اس کو محفوظ رہنا چاہیئے اور اسی آب و تاب کے ساتھ رہنا چاہیئے۔ اور نئی نسلوں کو اس سے روشناس کرانا چاہیئے اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر اسلاف کے کارنامے جمع کرنے چاہئیں۔ لیکن اس دین کے لئے خدا فیصلہ کر چکا ہے کہ یہ دین قیامت تک کے لئے ہے لہٰذا اس کو زندہ اشخاص کی ضرورت ہے، روحانیت بھی زندہ انسانوں ہی سے قائم ہے، محققین صوفیاء کی اور مشائخ کی

تحقیق بھی یہی ہے کہ تزکیہ، علمِ باطن بھی زندہ انسانوں ہی سے حاصل کیا جاتا ہے اور زندہ انسانوں ہی سے اس کی تکمیل ہوتی ہے، ورنہ ایسے ایسے بلند مرتبہ لوگ گزرے ہیں کہ ان میں سے ایک کافی تھا۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ زندگی میں حرکت و نمو ہے، زندگی میں تنوع ہے، ابھی ایک رنگ آیا ایک رنگ گیا، ابھی ایک مرض پیدا ہوا اور ایک مرض گیا، اس لئے جن کا تعلق اس زندہ کائنات اور عالمِ طبیعی سے ٹوٹ چکا ہے وہ ان متحرک اور زندہ انسانوں کی رہنمائی نہیں کر سکتے۔ فیض ان سے حاصل ہو سکتا ہے (فیض کے جو طریقے ہیں ان کے ذریعہ) اس میں غلط فہمی نہ ہو لیکن رہنمائی زندہ انسانوں ہی سے حاصل ہوتی ہے، کسی نسل میں سب کچھ ہے، بڑے کتب خانے ہیں، تاریخ کے بڑے بڑے ذخیرے ہیں لیکن زندہ ہستیاں نہیں ہیں جن کے قلوب سے اور جن کے اجتہادِ فکر سے، جن کے تفقہ سے، جن کی بصیرت سے ہم روشنی حاصل کریں، اس نسل کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔

دین تازہ ہوتا رہے گا

حدیث صحیح میں ہے کہ "ان اللّٰہ یبعث علی رأس کل مائة سنة من یجدد لھذہ الامة أمر دینھا" سنن کی حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر سو برس میں ایک مجدد بھیجتا رہے گا، جو اس دین کو تازہ کرے گا اور تجدید کا فرض انجام دے گا، اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس وقت تو وہ دین کو تازہ کر دے گا، پھر وہ سلسلہ ختم ہو جائے گا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عرصہ تک اس کا وجود رہے گا۔ من یجدد لھذہ الامة أمر دینھا" کا یہ مطلب نہیں کہ وہ آئے اور ہفتہ دو ہفتہ کے لئے دین کا چرچا ہو گیا۔ اور چلے گئے۔ ان میں سے کسی بھی بزرگ کا حال پڑھیں، کسی کا اثر سو برس تک رہا اور بعض ایسے لوگ پیدا ہوئے جن کا اثر صدیوں تک رہا۔

ریلوے لائن پر ایک چھوٹی گاڑی چلا کرتی تھی۔ (اور غالباً اب بھی چلتی ہے) جس کو ٹرالی کہتے تھے، لوگ اس کو ٹھیلتے تھے اور پھر اس پر بیٹھ جاتے تھے اور وہ چلتی اور پھسلتی رہتی تھی، جب وہ رکنے لگتی تھی تو پھر اتر کر

دھکا دیتے تھے اور بیٹھ جاتے تھے، اس سے لائن کا معائنہ ہوتا تھا، اس امت کی گاڑی کو بھی اسی طرح سمجھیے اور اس کو ٹھیلنے والے اس امت کے علماء اور مشائخ اور مجدد ہیں، یہ اس کو ٹھیل دیتے ہیں اور وہ خود اپنے پہیوں پر چلتی ہے، یہ نہیں کہ اس کو چلاتے ہی رہتے ہیں، گاڑی خود چلے گی اپنے پہیوں پر لیکن اس کو ٹھیلنے اور چلانے کے لئے زندہ انسانوں کی ضرورت ہے۔ وہ کوئی ٹیکنیکل چیز نہیں، زندہ انسان اس کو بڑھاتے ہیں اور ٹھیلتے ہیں۔ اور وہ اپنے پہیوں پر چلتی ہے کیونکہ ٹرالی کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے، پٹریوں میں اتنی چکناہٹ اور پہیوں میں اتنی حرکت و سرعت اور چلنے کی اتنی صلاحیت ہو کہ وہ چل سکے اور آدمیوں کے ہاتھوں میں اتنی طاقت ہو کہ وہ اس کو ٹھیل سکیں، اور مسافر جو بیٹھے ہوں وہ ایسے ہوں کہ بیٹھے رہیں اور جم جائیں، اس امت کی روایت یہ ہے کہ جب اس پر تعطل اور بے عملی طاری ہونے لگتی ہے تو کوئی اللہ کا بندہ آتا ہے اور اس کو دھکا لگاتا ہی اور پھر وہ خود چلتی ہے اور کچھ دور تک چلی جاتی ہے۔

میں مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ دونوں کو اس دور کا مجدد سمجھتا ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ جہاں کہیں بھی علم دین ہے، جہاں کہیں بھی سنت کی دعوت ہے، جہاں کہیں بھی شرک و بدعت سے اجتناب کا جذبہ اور اس سے تنفر ہے، یہ ان دونوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے، دیکھئے ایک ایسا بھی انسان تھا جس نے اس زور سے دھکا دیا کہ امت کی گاڑی ساڑھے تین سو سال سے برابر چل رہی ہے اور اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ کتنا چلے پھر کوئی اور اللہ کا بندہ پیدا ہو اور اسکے دھکے سے اور کتنا چلے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا پورا خاندان، حضرت مجدد الف ثانیؒ کے سو ڈیڑھ سو برس بعد پیدا ہوا اور ان کے کام کے اثرات تیرھویں صدی کے ابتداء میں ظاہر ہوئے، میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ فریضہ ہے تمام مدارس کا اور تمام علماء کا کہ زندہ اشخاص پیدا کرتے رہیں۔

پاکستان کی سب سے بڑی ضرورت

کل میں نے دارالعلوم کورنگی میں ایک بات کہی تھی کہ پاکستان کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ایسے علماء

ملک میں رہیں کہ وہ نئے مسائل سمجھ سکیں اور نئے مسائل کے حل پیش کر سکیں، اور اس میں وہ شریعت کی مدد سے کتاب وسنت کی مدد سے، اصولِ فقہ اور فقہ کی مدد سے رہنمائی کر سکیں، اسلئے جہاں اور چیزوں کی ضرورت ہے وہاں ایک بڑی ضرورت یہ ہے کہ ایسے متبحر علماء پیدا ہوں جیسے مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی، مولانا محمد یوسف صاحب بنوری، اور دوسرے علماء جن کے نام اُس وقت مجھے یاد نہیں آئے، پھر اس کے بعد میں نے کہا کہ زمانہ اتنا ترقی کر گیا ہے اور اب زمانہ کے فتنے اتنے سنگین اور زمانے کے چیلنج اتنے شدید ہیں کہ حقیقۃً ضرورت تھی امام غزالی شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی، لیکن اگر حجۃ الاسلام غزالی، شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور حکیم الاسلام شاہ ولی اللہ اس وقت نہ پیدا ہوں تو کم از کم اس درجہ کے لوگ پیدا ہوں جن کے نام میں نے لئے۔ لہٰذا مدارس کا یہ فرض ہے کہ وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں کہ وہ تبحر پیدا ہو، وہ وسعتِ نظر اور عمق اور نظر کی گہرائی اور گیرائی پیدا ہو اور وہ کتاب وسنت کی روح سے واقفیت پیدا ہو، مقاصدِ شریعت سے آگاہی پیدا ہو کہ بدلے ہوئے زمانہ میں امت کی رہنمائی کر سکیں، محض یہ کہ کتاب میں دیکھ لو یہ کافی نہیں، اس لئے کہ کتابیں تو اپنے اپنے عہد میں لکھی گئی ہیں، اللہ نے صرف کتاب اللہ کی یہ خصوصیت قرار دی ہے کہ لا تبلی جدتہ ولا تنتھی عجائبہ کہ وہ کبھی پرانی نہیں ہوگی، باقی ہر انسانی کتاب میں اُس عہد کی چھاپ ہوتی ہے، اُس عہد کے گھنے سائے ہوتے ہیں، آپ کسی عالم کی کتاب اٹھا کر دیکھ لیجئے، اگر اللہ نے آپ کو ذوق اور علمی بصیرت دی ہے تو آپ اسے دیکھ کر زمانہ کا تعین کر سکتے ہیں کہ یہ کتاب فتنۂ تاتار سے پہلے لکھی گئی ہوگی یا فتنۂ تاتار کے بعد لکھی گئی ہوگی، یہ آٹھویں صدی کی تصنیف معلوم ہوتی ہے، ہر صدی کا اسلوب الگ ہوتا ہے، فکر اور علم کا طرز الگ ہوتا ہے، ان کے درجات الگ ہوتے ہیں، یہ مدارس بہت مبارک اور نہایت ضروری ہیں، ہم سب مدارس ہی کے خوانِ نعمت کے ریزہ چیں ہیں اور میں جو آپ کے سامنے بیٹھا ہوا بات کہہ رہا ہوں، یہ مدارس ہی کا فیض ہے، اول سے آخر تک میری تعلیم اسی نہج پر ہوئی، لیکن میں یہ کہنا چاہتا ہوں (او خدا کرے کہ میری بات جتنی ہے اور جس درجہ کی ہے اسی کے مطابق سمجھا جائے) کہ یہ دین زندہ ہے اور زندہ انسانوں کی اس کو ضرورت ہے، اور زندہ انسانوں ہی کے دم سے یہ چلے گا، اسلاف کی عظمت میں رتی برابر کمی کرنا

مقصود نہیں ہے، مقصد یہ ہے کہ اس پر قناعت نہیں کرنی ہے کہ اسلاف نے یہ کیا، کوئی مسئلہ پوچھنے آئے تو کہے کہ ہمارے یہاں ایک سے ایک بڑا عالم پیدا ہوا، آسمانِ علم، جبلِ علم، سائل کہتا ہے کہ کنویں میں فلاں جانور گر گیا ہے، تمام محلہ والے پریشان ہیں کتنے ڈول پانی نکالا جائے، آپ کہیں کہ ہمارے یہاں امام ابوحنیفہؒ پیدا ہوئے، امام زفرؒ پیدا ہوئے اور آخر میں بدائع الصنائع کے مصنف، البحرالرائق کے مصنف اور فتاوی عالمگیری کے مصنف پیدا ہوئے، وہ کہے گا حضرت یہ سب صحیح ہے، لیکن جلدی بتائیے نماز کا وقت بالکل قریب ہے کہ اس کو کس طرح پاک کیا جائے؟ کوئی آپ سے یہ پوچھنے آئے کہ ذرا سی یہ عبارت سمجھ میں نہیں آئی، یہ شعر سمجھ میں نہیں آیا، اس کے معنی بتائیے، آپ کہیں کہ ہمارے یہاں ایسے ایسے ادیب پیدا ہوئے جن کا جواب نہیں، عبدالقاہر جرجانی پیدا ہوئے، ابوعلی فارسی پیدا ہوئے، امام زمخشری پیدا ہوئے، حریری پیدا ہوئے اور قاضی فاضل پیدا ہوئے، اور ہندوستان میں بھی ایک سے ایک بڑھ کر ہوئے ہیں، وہ کہے گا یہ سب ٹھیک ہے لیکن میں کتاب پڑھانے جا رہا ہوں، طالبِ علم منتظر ہیں، جلدی سے شعر کا مطلب بتائیے، اسی طرح ہر فن کا حال ہے جس فن کا آدمی آیا تو کہہ دیا کہ ہمارے یہاں ایسے ایسے لوگ پیدا ہوئے ہیں، اس سے کام نہیں چلے گا۔

ہر شہر میں متبحّر آدمی ہونے چاہئیں

ہر ملک میں بلکہ ہر شہر میں ایسے متبحّر آدمی ہونے چاہئیں جو وقت پر مدد کر سکیں، رہنمائی کر سکیں، یہ نہ کر سکیں تو کم از کم کسی عالم کا حوالہ دے سکیں، میں خود یہ کرتا رہتا ہوں، کوئی اہم مسئلہ پوچھنے آتا ہے تو میں کہہ دیتا ہوں کہ ہمارے مدرسہ میں مفتی موجود ہیں ان سے پوچھو" لکل فن رجال" ہر فن کا شخص الگ الگ ہے، وہ فقہ پڑھاتے ہیں۔ علامہ ابن حزم کے متعلق امام ابن تیمیہ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ انھوں نے سعی میں رمل و اضطباع کو لکھ دیا ہے، وہ بہت ادب کے ساتھ کہتے ہیں کہ ان کو حج کرنے کا موقع نہیں ملا تو ان کو طواف اور سعی میں التباس ہو گیا۔ یہ بات الگ ہے، لیکن ہر چیز میں آپ اسلاف کے کارناموں کی

فہرست گنانے لگیں کہ کیسے کیسے آدمی پیدا ہوئے تو اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص پیاسا ہو اور پانی پینے آئے اور کہے کہ پانی پلا دیجئے تو آپ اس سے کہیں کہ دنیا میں ایسی ایسی سبیلیں لگی ہیں اور ایسی ایسی آئس کریمیں ایجاد ہوئی ہیں، ایسے ایسے مشروبات ایجاد ہوئے ہیں، تو بھائی مشروبات کے نام لینے سے اور اس میں جو ترقیاں آپ کے اسلاف نے کیں، اس سے کیا ہوتا ہے، اس کو تو پانی چاہیئے، چاہے آپ کٹورہ میں دیں یا مٹی کے کونڈہ میں دیں، جب جا کر اس کی پیاس بجھے گی۔

خلا پُر کرنے کے لئے جانفشانیوں کی ضرورت ہے

علوم کا زوال بلکہ امتوں کا زوال اسی طرح ہوا کہ جب کوئی گیا تو کوئی دوسرا اس کی جگہ لینے والا نہیں، آج خطرہ اسی بات کا ہے، جو اٹھتا ہے جگہ خالی کر کے چلا جاتا ہے، آپ سے کیا کہوں، یہ کہنے کی بات نہیں ہندوستان میں ہم کیا خلا محسوس کر رہے ہیں کسی مدرسہ میں شیخ الحدیث کی ضرورت ہے، شیخ الحدیث نہیں مل رہا ہے، کہیں اصول فقہ پڑھانے والا نہیں مل رہا ہے، کچھ اللہ کے بندے یہاں آ گئے اور کچھ اللہ میاں کے یہاں چلے گئے، ایک انتقال کیا تو دوسرا منتقل ہو گیا، ہمارے حق میں نتیجہ ایک ہوا، مطلب یہ ہے کہ خلا پُر ہونا چاہیئے اور اس کے لئے جانفشانیوں کی ضرورت ہے، یہ کام بغیر جانفشانیوں کے نہیں ہو سکتا، اگر آپ چاہتے ہیں کہ حدیث کا جید عالم پیدا ہو، فقہ کا کوئی جید عالم پیدا ہو، تو اس کے لئے پتّا پانی کرنے کی ضرورت ہے، اور افسوس ہے کہ اب ہمارے مدارس میں اس کا رواج نہیں رہا، سب کچھ ہے لیکن وہ محنت نہیں ہے، میں کہتا ہوں کہ مبالغہ سہی، غلو سہی مگر کسی درجہ میں انہماک ہونا چاہیئے، یورپ میں جو ترقیاں ہوئی ہیں اسی لائن سے ان میں بھی استغراق ہے، میں نے واقعات سنے ہیں کہ بعض تحقیقی کام کرنے والوں کو اس کی خبر نہیں ہوئی کہ کب صبح ہوئی اور کب شام ہوئی، میرے جاننے والے ایک دوست جرمنی گئے تھے، انہوں نے کہا ایک صاحب سے پوچھا کہ آپ کب کام شروع کرتے ہیں، آپ کا یہ ادارہ کب سے کھلتا ہے؟ تو اس نے کہا ابھی بتاتا ہوں، وہ اندر گیا اور ایک آدمی سے پوچھا کہ میرا شعبہ کب سے

کھلتا ہے، اس نے بتایا اتنے بجے، تو آگر کہہ دیا اتنے بجے سے، میں نے کہا کہ کیوں آپ نے خود کیوں نہیں بتلایا تو اس نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں، میں اتنی صبح آجاتا ہوں کہ مجھے ہوش نہیں رہتا اور میں گھڑی بھی نہیں دیکھتا، کام کا جوش اتنا غالب ہوتا ہے۔

یہ انتشار کا دور ہے، آج کل تو بڑی مصیبت یہ ہے کہ آپ یہاں سے جائیے، پچاس چیزیں آپ کو ایسی نظر آئیں گی جو انتشار پیدا کرنے والی ہوں گی، آپ ایسے حالات دیکھیں گے جو انتشار پیدا کرنے والے ہوں گے آپ ایسی تصویریں دیکھیں گے جو ساری ذہنی یکسوئی ختم کر دیں گی اور اگر ٹیلی ویژن ہو رہا ہے تو سبحان اللہ یا انا للہ کہہ دیجئے، اُس زمانہ کی خوبی یہ تھی کہ انتشار پیدا کرنے والی چیزیں کم تھیں اور لوگوں میں علمی استغراق تھا، میرے ایک مغربی استاد نے بتایا کہ ایک صاحب مغرب (مراکش) میں فقہ مالکی پر کتاب لکھ رہے تھے، ان کا روزانہ کا یہ معمول تھا کہ دوپہر کو وہ گھر جاتے تھے اور کھانا کھاتے تھے اور آجاتے تھے، ایک دن وہ گھر نہیں گئے تو لوگوں نے کہا کہ آج آپ کھانے پر تشریف نہیں لائے؟ انھوں نے کہا کہ نہیں میں تو آیا تھا! میں نے کھانا بھی کھایا، اب ان کو فکر ہوئی کہ کیا بات ہوئی، معلوم ہوا کہ مسئلہ سوچتے ہوئے نکلے اور ایک گھر کا دروازہ کھلا تھا اس میں چلے گئے اور وہ لوگ اتنے مثقف اور مہذب تھے کہ انھوں نے کھانا کھلایا اور ان کو بالکل محسوس نہیں ہونے دیا کہ ان کا گھر نہیں ہے، اس زمانہ میں علماء کی قدر تھی، ان کو شاید یہ معلوم تھا کہ وہ اس وقت نکلتے ہیں اور کھانا کھاتے ہیں، گھر والوں نے دسترخوان بچھایا، ہاتھ دھلائے، انھوں نے کھانا کھایا، ہاتھ پونچھے اور اپنی جگہ آگئے اور یہ سمجھتے رہے کہ وہ اپنے گھر گئے تھے اور کھانا کھایا تھا۔

ایک واقعہ امام غزالی نے غالباً احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ امام شافعی ایک مرتبہ امام احمد بن حنبل کے گھر آئے۔ امام صاحب کے بچے کہتے ہیں کہ ہم دیکھتے تھے کہ ہمارے والد ہر نماز کے بعد امام شافعی کے لئے دعا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ "اے اللہ! محمد بن ادریس کو زندہ رکھ، قائم رکھ، ان کی عمر میں برکت دے۔" وہ بچے سوچتے تھے کہ ہمارے باپ امام وقت ہیں، ان کے استاد کیسے ہوں گے جن کے لئے یہ دعا کرتے ہیں؟ تو ایک مرتبہ

پوچھا کہ ابا جان! آپ کس کے لئے دعا کرتے ہیں اور کیوں ؟ انھوں نے کہا " یا بنی انه کالشمس للدنیا و العافیة للبدن "۔ ایک مرتبہ لطیفہ پیش آیا کہ امام شافعی تشریف لے آئے تو گھر والوں نے سمجھا کہ گھر بیٹھے دولت ملی، بڑی خاطر مدارات کی اور رات کو جب وہ کھانا کھا کے اور باتیں کرکے بستر پر لیٹے تو بچوں نے سوچا کہ والد صاحب بڑا وقت عبادت میں گزارتے ہیں، یہ تو ہمارے والد کے بھی استاد ہیں، ان کی تو پلک بھی نہیں لگے گی، رات بھر عبادت کریں گے، چنانچہ انھوں نے لوٹا بھر کر رکھدیا کہ رات کو اٹھیں گے، وضو کریں گے، عبادت میں مشغول ہو جائیں گے لیکن وہ صبح تک سوتے رہے، یہاں تک کہ امام احمد بن حنبل آئے اور انھوں نے اٹھایا، وہ اٹھے اور بے وضو کئے ہی نماز پڑھنے چلے گئے، اب تو ان کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی کہ یا اللہ قصہ کیا ہے ؟ لوٹا دیکھا تو ویسا کا ویسا بھرا رکھا ہے، بڑی حیرت کہ انھوں نے بے وضو نماز پڑھی، اس زمانہ میں اعتراض کرنے کا رواج نہیں تھا، جب وہ مجلس میں آکر بیٹھے تو امام احمد بن حنبل سے امام شافعی نے کہا کہ ابو عبداللہ رات کو عجیب واقعہ پیش آیا جب تم مجھے لٹا کر گئے تو فلاں حدیث کی طرف میرا ذہن چلا گیا، میں نے اس سے مسائل استنباط کرنے شروع کئے، رات بھر مسائل استنباط کرتا رہا، مسائل کی ایک بڑی تعداد بیان کرکے فرمایا کہ اتنے مسائل استنباط کر چکا تھا کہ صبح ہو گئی "، اسی لئے شاعر نے کہا ہے ؎

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر　　　گرچہ باشد در نوشتن شیر شیر

اگر بدگمانی کا دور ہوتا تو اخبار میں چھاپ دیا جاتا کہ ایسے ایسے علماء ہیں جو بے وضو نماز پڑھ لیتے ہیں بلکہ پڑھا بھی دیتے ہیں (تعجب نہیں کہ انھوں نے نماز پڑھائی بھی ہو، بھلا ان کی موجودگی میں کون نماز پڑھاتا)۔

اللہ تعالیٰ ہمارے اس خلا کو پُر فرمائے

اکوڑہ خٹک میں حضرت سید احمد شہیدؒ کے جہاد و شہداء کا خون دارالعلوم حقانیہ کی شکل میں رنگ لایا

(ماخوذ از ماہنامہ الحق ــــــ)

یہ تقریر ۱۹ ر جولائی ۱۹۷۸ء کو دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں علماء، اساتذہ، طلبہ اور معززین کے سامنے کی گئی۔ مقرر کا تعارف مولانا سمیع الحق صاحب مدیر "الحق" نے کرایا۔

خطبہ مسنونہ کے بعد!

عبادت کی مشقت

میرے بزرگو، دوستو اور عزیزو! ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک عشاء کی نماز کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حجرۂ مبارک سے باہر تشریف نہیں لائے، بہت دیر ہوگئی، جو معمول تھا معمول کے مطابق آپ وارد نہیں ہوئے۔ مسلمان اس اشتیاق میں بیٹھے ہوئے تھے کہ جن کی تعلیم سے اور جن کی برکت سے نماز سیکھی ہے ان کے پیچھے اس مسجد میں جو اُسس علے التقوی کا مصداق ہے عشاء کی نماز پڑھ کر اپنے گھر جائیں اور آرام کریں، یہ لوگ وہ تھے جو دن بھر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہیں رہے تھے، بلکہ کھیتوں میں، باغوں میں، دوکانوں پر سارا دن محنت کرتے رہے تھے۔ وہ گرمیوں کا زمانہ تھا یا جاڑوں کی رات تھی، اگر گرمیوں کا زمانہ تھا تو مدینہ کی گرمی سب کو معلوم ہے، بہت سخت، ایسی جھلسا دینے والی، جلا دینے والی گرمی، اس میں سارا دن کام کرتے رہے اور اب آئے تھے کہ نماز پڑھ کر جا کر سو رہیں گے لیکن اللہ کا رسول

حجرے سے باہر نہیں آیا تھا، لوگ کچھ اونگھنے لگے تھے، کچھ سونے لگے تھے، سب پر نیند کا اور تھکن کا غلبہ تھا، حضرت عمرؓ نے جو امت کے اتالیق تھے اور بڑے شفیق تھے، انھوں نے محسوس کیا اور آواز دی کہ یا رسول اللہؐ بچے اور عورتیں سونے لگے ہیں، آپ باہر تشریف لائیے، لوگوں پر ایک نگاہ ڈالی اور فرمایا کہ اس وقت روئے زمین پر نماز کے انتظار میں جاگنے والے تمہارے سوا اور کوئی نہیں، یعنی جاگنے والے تو بہت ہیں اور جمع ہونے والے بھی بہت ہیں، تقریر کے لئے، ملنے جلنے کے لئے وقت کاٹنے کے لئے، لیکن تمھارے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

اسلام ہند میں

ہجرت کے شروع کا یہ قصہ ہے یاد رہیان کا۔ تو اصل میں قیمت اور قدر کی نوعیت ہوتی ہے قیمت مقصد اور نوعیت کی ہے، تعداد اور اژدحام کی نہیں، اسی طریقے سے ہندوستان میں جب سے اسلام آیا ہے، لڑائیوں کا سلسلہ برابر جاری رہا، فتوحات پر فتوحات ہوتی رہیں اور اتفاق سے فاتح آپ کے اس علاقے سے داخل ہوتے رہے، درۂ خیبر سے یا بولان سے یہاں سے اسلامی فوجیں گزرتی رہیں اللہ ان کو جزائے خیر دے ہم ان کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں کہ ان کی برکت سے ہندوستان میں اسلام کا جھنڈا بلند ہوا، اسلام چاہے سندھ میں ملتان تک عربوں کے ذریعہ زیادہ پھیلا ہو لیکن بہر حال اسلام کی عظمت یہاں قائم ہوئی اور بہت سے ایسے لوگ جو تعبیر کی افادیت اور مادی فائدہ دیکھے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتے، انہوں نے اسلام قبول کیا اور اس کے بعد ان کی اولاد میں ہزاروں لاکھوں اولیاء اللہ اور علماء ربانی پیدا ہوئے ہم ان بادشاہوں کا اور فاتحین کا بھی احسان نہیں بھول سکتے اور ہم ان لوگوں میں سے ہونا چاہتے ہیں جن کے متعلق قرآن مجید میں آیا ہے کہ والذین جاءوا من بعدھم یقولون ربنا اغفرلنا و لاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلاً للذین اٰمنوا ربنآ انک رءوف رحیم ٥ اللہ تعالٰی فرماتے ہیں

ان مہاجر و انصار کے بعد جو لوگ آئیں گے وہ کہیں گے کہ یا اللہ ہماری مغفرت فرما اور ہمارے ان بھائیوں کی بھی جو الذین سبقونا بالایمان۔ جو ایمان میں سبقت لے گئے، و دنیا سے ایمان کے ساتھ پہلے چلے گئے تو ہم محمود غزنوی اور ان سے پہلے اگر کوئی آیا ہو تو اس وقت سے لیکر احمد شاہ درانی تک جو اس راستہ سے آنے والوں میں سب سے آخر میں آنے والا تھا اور جس نے مسلمانوں کے خلاف جو طاقتیں جمع ہو رہی تھیں ہندوستان میں اور جن کی قیادت مرہٹے کر رہے تھے ان طاقتوں کی کمر توڑ دی۔ اور مغلیہ سلطنت ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کی عظمت و تہذیب کے گل ہوتے چراغ کو پھر تھوڑا سا تیل اور بتی مہیا کر دی اور ہندوستان کے مسلمان پھر پچاس ساٹھ برس کے لئے یہاں اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگے اور اسلام کی شوکت کا نقش قائم ہو گیا، ہم ان سب کے لئے دعائے خیر کرتے ہیں اور انشاء اللہ کرتے رہیں گے اور ہم کو یہ راستہ بھی عزیز ہے جس راستے سے یہ فاتح اور کشور کشا آئے لیکن جیسا کہ ابھی مولانا سمیع الحق صاحب نے فرمایا اور بجا فرمایا کہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے، خالص اللہ کی رضا کے لئے، سنتوں کو زندہ کرنے کے لئے، مسلمانوں کی زندگی کو شریعت کے سانچے میں ڈھالنے کیلئے اور ادخلوا فی السلم کافۃ کا پیغام پہنچانے اور عمل کرانے کے لئے، حدودِ شرعیہ کو نافذ کرنے کے لئے، قوانین شریعت کو رائج کرنے کے لئے جو پہلا خون ہندوستان میں صدیوں کے بعد ہی نہیں بلکہ عالمِ اسلام میں ـــ تھوڑے بہت مطالعہ کی بناء پر جس کا موقع مجھے مل سکا ہے یہ کہہ سکتا ہوں کہ ـــ عالمِ اسلام میں صدیوں بعد جو پہلا پاک خون ـــ دم ذکی ـــ جس میں کوئی ملاوٹ نہیں تھی، وہ خون جس سرزمین میں پہلی بار بہا ہے وہ آپ کی سرزمین ہے۔ یہ اکوڑہ خٹک کی زمین ہے۔ جس کے متعلق مرزا مظہر جان جاناں کا شعر صحیح ہو گا ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن ... خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

جہاد کی تین شرطیں

یہاں بنا و رکھی گئی اس جہادِ خالصۃً لوجہ اللہ کی جس کا رواج دنیا میں قریب قریب ختم ہو چکا تھا۔

کسی بادشاہ کے متعلق، کسی غازی کے متعلق، کسی فاتح کے متعلق تاریخ نہیں لکھتی کہ جہاد شروع کرنے سے پہلے اس نے اعلان نامہ بھیجا ہو کسی حریف کو جس کے خلاف اسے جہاد کرنا تھا کہ تین چیزیں ہیں، پہلی دعوت ہماری یہ ہے کہ تم اسلام قبول کرلو۔ اگر تم اسلام قبول کرلو گے تو ہم یہ زمین تمھارے حوالے کر جائیں گے، تم ہمارے بھائی ہو گے پھر ہمیں کوئی حق نہیں ہو گا کہ بستی مٹا کر تمھاری جگہ بیٹھیں، اس لئے کہ یہ آقاؤں کا تبادلہ نہیں، یہ دین کا اور مسلک کا تبادلہ ہے، یہ اللہ کے ساتھ عہد و پیمان کرتے ہو تو تم زیادہ حقدار ہو، اگر تمھیں یہ منظور نہیں تو تم جزیہ دینا منظور کرو یا باجگذار ہمارے بن جاؤ۔ ہم تمھاری حفاظت بھی کریں گے اور تمھیں اپنے حال پہ باقی رکھیں گے، اگر یہ بھی منظور نہیں تو پھر لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ جہاد کی یہ تین شرطیں تھیں اور یہ بات اتنی مشہور ہو گئی تھی کہ فتوح البلدان بلاذری میں آتا ہے کہ جب سمرقند فتح ہوا تو وہاں کے لوگوں کو کسی طرح پتہ چل گیا کہ اصل ترتیب اسلام میں یہ ہے کہ سب سے پہلے اسلام کی دعوت دی جائے پھر اس کے بعد جزیہ کی پیشکش کی جائے، اگر وہ بھی منظور نہ ہو تو پھر قتال ہے۔ تو انھوں نے دیکھا کہ سمرقند میں فوجیں داخل ہو گئیں بغیر دعوت اسلام دیئے اور بغیر جزیہ کا مطالبہ کئے تو ان کو ایک عرصہ کے بعد ہوش آیا جب کہ مسلمان وہاں بس گئے تھے، یاں گھر بنا لئے تھے۔ تو انھوں نے ایک وفد روانہ کیا حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی خدمت میں جنھیں خلفاء راشدین میں شامل کیا جائے، وہ جنھیں خلیفۂ خامس کہتے ہیں، ان کو معلوم ہوا کہ وہ خلیفۂ عادل ہیں اور شریعت پر پورا عمل کرتے ہیں تو ایک وفد ان کے پاس حاضر ہوا اور ان سے شکایت کی کہ سمرقند بغیر اس سنّت کے اور بغیر ایک حکم شرعی پہ عمل کئے فتح ہو گیا ہے۔ انھوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے ایک پرچہ لکھا وہاں کے قاضی کے نام کہ جس وقت تمھیں یہ پرچہ ملے تو اسی وقت عدالت کرو اور وہاں اس بات پر شہادت لو کہ جس وقت مسلمانوں کے قائد، فوج کے قائد نے سمرقند فتح کیا، کیا اس وقت اس سنت پر عمل کیا گیا تھا یا نہیں۔ اگر ثابت ہو جائے اور کوئی شہادت اس امر پہ نہ ہو کہ پہلے اسلام اور پھر جزیہ کی دعوت دی گئی تھی

تو تمام مسلمان فوجیں اسی وقت سمرقند چھوڑ کر اس کی حدود سے باہر جا کر کھڑی ہو جائیں، اس کے بعد اس سنّت پر عمل کریں، پہلے اہلِ سمرقند کو اسلام کی دعوت دیں اگر منظور ہو تو فبہا، نہ ہو تو پھر جزیہ کا کہیں، اسے بھی نہ مانیں تب جہاد کریں۔ قاضی صاحب کو پرچہ ملا، انھوں نے عدالت طلب کی، مدعا علیہ مسلمانوں کی فوج کے قائد ہیں، اور دنیا کی تاریخ میں شاید اس واقعہ کی نظیر نہ ملے کہ ایک کمانڈر جس نے اپنی نوکِ شمشیر سے اتنا اہم علاقہ، ترکستان کا دارالخلافہ فتح کیا تھا وہ مدعیٰ علیہ اور ایک معمولی مسلمان کی حیثیت سے حاضر تھا اس مسجد میں، اس سے پوچھا گیا، اس نے اعتراف کیا کہ ہاں مجھ سے یہ غلطی ہوئی کہ میں یلغار میں اور اسلامی فتوحات کے تسلسل میں اس اہم شرعی حکم پر عمل نہیں کر سکا، اور جب یہ معاملہ ثابت ہو گیا تو قاضی صاحب نے حکم دیا کہ مسلمان اس شہر سے تخلیہ کریں، اسے خالی کریں، مسلمانوں نے گھر بنا لئے تھے، کھیتیاں جوت لی تھیں، بہت سے لوگوں نے اسے اپنا شہر بنا لیا تھا تو سب کچھ چھوڑ کر دامن جھاڑ کر چلے گئے، باہر جا کر کھڑے ہو گئے، جب وہاں کے بت پرستوں نے یا بدھ مذہب کے ماننے والوں نے مشرکوں نے یہ معاملہ دیکھا کہ شریعت کا اتنا احترام ہے ان کے دلوں میں اور عدل و انصاف کا اتنا لحاظ ہے کہ وہ اپنے قائد اور کمانڈر انچیف پر بھی اسے نافذ کرتے ہیں تو انہوں نے کہا کہ اب لڑائی کی ضرورت نہیں، ہم خود مسلمان ہوتے ہیں۔ چنانچہ سمرقند سارے کا سارا مسلمان ہو گیا اس واقعہ کے ذریعہ — میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ اس وقت بھی جہاد کی اس سنت پر عمل کسی وقت چھوٹ جاتا تھا۔ اور اس کے بعد تو معلوم نہیں تاریخ کا تعیّن تو مشکل ہے مگر اس کے بعد مسلمانوں کی فتوحات کی تاریخ میں ہم یہ نہیں دیکھ سکتے کہ اس سنّت پر عمل کیا گیا ہو، ہوا یہ کہ فوجیں بڑھتی چلی جاتی تھیں اور جو علاقے اور جو شہر ان کے راستے میں آتے انہیں فتح کر کے آگے بڑھتے جاتے مگر اس اللہ کے بندے نے اس مردِ مجاہد نے جس کا نام حضرت سید احمد شہیدؒ ہے اور ان کے ساتھی مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ جنھیں ان کا وزیرِ اعظم کہئے یا دستِ راست کہیئے، یا دست و بازو کہیئے یا لشکر کے قاضی مفتی اور شیخ الاسلام کہیئے، ان دونوں نے پہلی مرتبہ اس سنّت پر عمل کیا اور یہیں سے وہ اعلان نامہ لاہور روانہ کیا گیا جو لفظ بلفظ کتابوں میں منقول ہے

تو یہی وہ سرزمین ہے جو ان مجاہدوں کے خون سے لالہ زار بنی۔

خونِ شہیداں ضائع نہیں ہوتا

خونِ شہیداں ضائع نہیں ہوتا، وہ ہزاروں باغ کھلاتا ہے اور اس کے نتیجے میں جیسے باغ پیدا ہوتے ہیں اسی طرح مدرسے بھی پیدا ہوتے ہیں، خانقاہیں بھی پیدا ہوتی ہیں، مسجدیں بھی صفحہ وجود میں آتی ہیں اور وہ زمین اللہ کی راہ میں وقیع ہو جاتی ہے، اس لئے کہ اس پر شہیدوں کا اور مجاہدوں کا خون بہا ہے۔ تو آپ کی اس سرزمین کو یہ فخر حاصل ہے کہ یہاں پر اللہ کی راہ میں اس جہاد کا آغاز ہوا اور ابھی میں راستے میں سنا رہا تھا کہ ہمارے رائے بریلی کے ایک خان صاحب تھے عبدالمجید خان صاحب ان کا نام بھی اس فہرست میں شامل تھا، جنھیں رات کو بھیجا جانا تھا اکوڑہ کے چھاپہ کے لئے، رات کو چھاپہ ڈالنا تھا اور یہاں سے مجاہدین کی جو فرودگاہ تھی، ۶ کوس یا ۸ کوس کے فاصلے پر اور پھر رات ہی کو شبخون مار کر واپس ہونا تھا تو حضرت سید احمد شہیدؒ کے سامنے جب فہرست آئی تو ان کو معلوم تھا کہ عبدالمجید خان صاحب بیمار ہیں اور کمزور ہیں تو ان کے نام کے سامنے نشان لگا دیا کہ ان کا نام نکال دیا جائے کہ یہ کوئی جہاد کا اختتام نہیں آغاز ہے، پھر بہت سے مواقع آئیں گے ان کے جہاد کے۔ تو ان کو جب معلوم ہوا کہ میرا نام فہرست سے نکال دیا گیا ہے تو کوئی اور ہوتا تو اس موقع کو غنیمت سمجھ لیتا کہ چلئے سر پر آیا ایک خطرہ تو ٹل گیا کہ چند آدمی دس ہزار کی فوج پر چھاپہ ڈالنے جا رہے ہیں، راستہ کے نشیب و فراز سے ناواقف ہیں۔ تو پہلا تجربہ تھا۔ سوچتے کہ معلوم نہیں کیا صورت پیش آئے تو وہ ایسے موقع کو غنیمت سمجھ لیتے کہ مجھے بھی کچھ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی میرا نام امیرالمومنین نے خود ہی کاٹ دیا۔ اس سے زیادہ بہتر کیا بات ہوگی۔ لیکن ایسا نہیں بلکہ وہ خود دوڑتے ہوئے آئے اور شکایت کی میرا نام فہرست سے کیوں کاٹ دیا ہے؟ فرمایا بھئی تمہیں بخار آ رہا ہے، میں سنتا ہوں کہ تم بیمار اور کمزور ہو اور یہ بڑا سخت چھاپہ ہے، اس کے لئے جفاکش اور تنومند لوگوں کی ضرورت ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ حضرت آج جہاد فی

جہاد فی سبیل اللہ کی بنیاد قائم ہو رہی ہے اور یہ پہلا موقع ہے، تو کیا میں اس بنیاد کے موقع سے محروم رہ جاؤں؟ میرا نام اللہ اس فہرست میں شامل کر دیجئے۔ تو ان کا نام اس فہرست میں شامل کر لیا گیا اور اللہ نے ان کو قبول فرمایا اور وہ اس چھاپہ میں شہید ہوئے۔

دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ کی ضرورت

تو یہ سارے واقعات اس سرزمین کے ہیں پھر یہاں سے دوسرا مقام سیدو میں ہوا جو آپ کے قریب ہے، اس کے بعد پھر ہوتے ہوتے ہنڈ وغیرہ میں معرکے ہوئے، جہانگیرہ وغیرہ میں، میں ان سب ناموں سے مانوس ہوں، اس راستہ پر آج میں پہلی مرتبہ آیا ہوں اور اس سے قبل پشاور اور مردان کے راستہ آنا ہوا تھا جو آج سے ۳۴-۳۵ برس پہلے کا واقعہ ہے جب دارالعلوم حقانیہ نہیں تھا اور میں آیا اور گھوم پھر کر چلا گیا کیا معلوم تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا اور میری عمر وفا کرے گی اور اللہ مجھے اس وقت تک زندہ رکھے گا کہ میں پھر دوبارہ یہاں آؤں گا اور اپنی آنکھوں سے اس دارالعلوم کو دیکھوں گا جہاں ان شہیدین کی نہ صرف یاد تازہ ہے بلکہ اپنا انتساب بھی ان کی طرف کیا جاتا ہے، یہ نسبت، یہ نسبتِ گرامی ایسی ہے کہ انشاء اللہ رنگ لائیگی، خونِ شہیداں رنگ لایا، یہ نسبت انشاء اللہ رنگ لائیگی۔ اس کا نام حقانیہ ہے اس میں حقانیت انشاء اللہ قائم رہے گی اور یہاں سے جو لوگ نکلیں گے وہ حقانیت کے علمبردار ہوں گے، اللہ تعالیٰ حضرت شیخ الحدیث اور شیخ العلماء حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدظلہٗ کی زندگی میں برکت عطا فرمائے اور اس مدرسہ کی کامیابیوں کو دیکھکر ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور وہ خوش ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کے لگائے ہوئے اس باغ کو سرسبز و شاداب رکھے اور پھلتا پھولتا رکھے۔ یہاں اس سرزمین میں ایک ایسا مدرسہ ضرور ہونا چاہیئے تھا جہاں قال اللہ اور قال الرسول کی آوازیں بلند ہوں، اس لئے کہ یہ اسی قال اللہ اور قال الرسول ہی کا نتیجہ تھا کہ کتنے اللہ کے بندے ہتھیلیوں پر سر رکھے ہزاروں میل سے ہندوستان سے کہاں کہاں سے یہاں پر آئے اور کہاں یہ میدان،

یہ قال اللہ اور قال الرسول ہی تھا جو ان کو اتنی دور کھینچ لایا اور یہاں جب تک قال اللہ اور قال الرسول کی صدائیں بلند ہوتی رہیں گی انشاء اللہ تعالیٰ اللہ کی رحمت برستی رہے گی ؎

ہنوز آں ابر رحمت درفشان ست　　خم و خمخانہ با مہر و نشان ست

ابھی یہ خمخانہ خالی نہیں ہوا جاری ہے اور حافظ کے اس شعر پر میں ختم کرتا ہوں

از صد سخنے پیرم یک نکتہ مرا یاد ست　　عالم نہ شود ویران تا میکدہ آباد ست

کہ اپنے مرشد کی سو باتوں میں سے ایک بات مجھے یاد رہ گئی ہے کہ عالم اس وقت تک ویران نہیں ہوگا جب تک کہ میکدہ قائم ہے، یعنی میکدۂ معرفت قائم ہے۔ قال اللہ اور قال الرسول کا مرکز قائم ہے اس وقت تک عالم ویران نہیں ہوگا اور یہ حدیث میں آتا ہے کہ جب تک ایک بھی اللہ اللہ کرنے والا باقی ہوگا، اس وقت تک قیامت نہیں آئے گی، آپ کو مبارک ہو، یہ سرزمین بھی مبارک ہو، کبھی کبھی ؎

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را　　گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را

اور اس دار العلوم کی آپ قدر کریں، اس کے اساتذہ اور اس کے علماء کی قدر کریں، یہاں ذہین طالب علم کو بھیجیں، اس لئے کہ اب ضرورت ہے جیسا کہ مولانا سمیع الحق صاحب نے اشارہ کیا کہ مغربیت کے فتنے میں ذہین لوگ سامنے آئیں کہ جن کے اندر حوصلہ ہو ولولہ ہو، اچھے خاندانوں کے ہوں، ان میں مجاہدوں کا خون ہو، شہیدوں کا خون ہو، امینوں کا خون ہو، وفاداروں کا خون ہو۔ وہ آئیں اور وہ لوگ علوم کتاب و سنت پڑھیں اور اس کے بعد اس سرزمین میں جو اس وقت ایک دوراہے پر کھڑی ہے اور یہاں اسلامی قانون کے نفاذ کے ارادے کئے جا رہے ہیں اور مطالعہ کئے جا رہے ہیں، وہ رہنمائی کریں۔

بس ان الفاظ کے ساتھ میں ختم کرتا ہوں، ـــــ میں نے یہاں آکر کسی پر احسان نہیں کیا اور کسی کے اوپر کوئی احسان نہیں بلکہ میں نے اپنے اوپر احسان کیا ہے اور بلانے والوں نے مجھ پر اور میرے ساتھیوں پر احسان کیا کہ یہ عزیز سرزمین ہم کو دوبارہ دکھلا دی۔ جس مقصد کے لئے یہ زمین رنگین ہوئی تھی اللہ تعالیٰ اس مقصد کو دنیا میں

عام کرے اور اسلام کا کلمہ بلند ہو، اسلام کو غلبہ حاصل ہو اور ہمارے گھروں میں، ہمارے دفتروں میں، ہمارے اداروں میں سب جگہ اسلام نافذ ہو۔

دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ فضل فرمائے۔ اللّٰھم انصر من نصر دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم واجعلنا منھم واخذل من خذل دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم ولا تجعلنا منھم۔ اللہ تعالیٰ ہمکو اور ہمارے سب دوستوں عزیزوں کو تمام روحانی وجسمانی بیماریوں سے شفائے کلی عطا فرمائے، صحت عطا فرمائے، اللہ تعالیٰ ہمیں اخلاص وللہیت عطا فرمائے، ہمارے قلوب کو منوّر فرمائے، ہمارے دماغوں کو روشن کردے، ہمارے اعضاء وجوارح کو قوت عطا فرمائے، ہماری آئندہ نسلوں میں اسلام کو قائم رکھے۔ آمین۔

تعارف

مجلسِ نشریاتِ اسلام

ایک عرصہ سے عالم اسلام میں ایسے لٹریچر کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی جو اسلام کی موثر وطاقتور نمائندگی اور ترجمانی کرے۔ ایمان ویقین کی بنیادیں ذہن ودماغ میں از سرِ نو استوار کرے، اس ذہنی بے چینی وانتشار کو رفع کرے جو مغرب کی مادہ پرست اور شک آفریں تہذیب و ادب نے عالمگیر پیمانے پر پیدا کر دیا ہے اور اس نئے ارتداد کا مقابلہ کرے جو طوفان وسیلاب کی طرح سارے عالم اسلام میں پھیل گیا ہے اور اسلام ایک زندہ اور معیّن مذہب ہونے کی وجہ سے خاص طور پر اس کی زد میں ہے۔ ان حقائق کے احساس اور ان خطرات کے اندازہ نے جو اس خلا کی وجہ سے عالم اسلام کو بالعموم اور ہمارے برِاعظم کو بالخصوص درپیش ہیں بعض سوچنے والوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ایسی تصنیفی واشاعتی مجلس کی تشکیل کریں جو ہر قسم کی جماعتی، سیاسی وتجارتی اغراض سے بالاتر ہو کر اسلام وانسانیت کی یہ خدمت انجام دے۔ چنانچہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی زیرِ صدارت مئی ۱۹۵۹ء میں "مجلس تحقیقات ونشریاتِ اسلام" کا قیام دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں عمل میں آیا۔ خدا کا شکر ہے کہ مجلس نے اپنے قائم ہونے کے بعد سے اس وقت تک کے قلیل عرصہ میں دینی و

علمی حلقوں میں خاصی مقبولیت اور وقعت حاصل کرلی ہے، اس کی شہرت میں برابر اضافہ ہو رہا ہے، اس کی مطبوعات کو قدر کی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جارہا ہے اور سرعت کے ساتھ ان کی اشاعت ہو رہی ہے۔

الحمد للہ صدر مجلس مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ، کی تحریری اجازت سے مجلس کی تمام مطبوعات کو پاکستان میں طبع و شائع کرنے کا انتظام ــــــ مجلس نشریات اسلام، ناظم آباد کراچی نے شروع کردیا ہے اور اب تک حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ، اور دیگر فاضل مصنفوں کی متعدد کتب جن میں حدیث، سیرت، تاریخ، ادب، سوانح، تذکرے، تقابلِ ادیان، عربی زبان و ادب کی تحصیل کے لئے مختلف کتب اور بچوں کو دینی تعلیم دینے نیز اردو سکھانے کے لئے بہترین کتابوں کا سلسلہ شامل ہے، معیاری کتابت، بہترین آفسٹ چھپائی، عمدہ کاغذ، جاذب نظر ٹائیٹل اور مناسب قیمت کے ساتھ شائع ہو چکی ہیں۔

فضلِ ربّی ندوی

ناظم مجلس نشریات اسلام - کراچی ۱۸

مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ

○ ** ◉ کی چند اہم شاہکار تصنیفات ◉ ** ○

نبی رحمت (صلی اللہ علیہ وسلم) حصہ اول (سیرت النبیؐ)	۲۴ — ۰۰
" " " " " " دوم	۲۱ — ۰۰
قیمت کامل دو حصے	۴۵ — ۰۰
تاریخ دعوت وعزیمت حصہ اوّل	۳۰ — ۰۰
" " " " دوم	۲۴ — ۰۰
" " " " سوم	۲۰ — ۰۰
قیمت کامل تین حصے	۷۴ — ۰۰
مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش	۱۸ — ۰۰
انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر	۲۲ — ۰۰
منصبِ نبوّت اور اس کے عالی مقام حاملین	۱۸ — ۰۰
دریائے کابل سے دریائے یرموک تک	۱۸ — ۰۰
تذکرہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ	۱۰ — ۰۰
جب ایمان کی بہار آئی۔	۱۸ — ۰۰

دیگر اہم مطبوعات

آپ حج کیسے کریں؟ —— مولانا محمد منظور نعمانی صاحب مدظلہ / مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ ۰۰ — ۱۲

علم جدید کا چیلنج — وحید الدین خاں ۰۰ — ۱۸

طوفان سے ساحل تک — محمد اسد سابق لیوپولڈ وس ۰۰ — ۱۸

تاریخ مشائخ چشت — حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ ۰۰ — ۱۲

مقالاتِ سیرت — ڈاکٹر آصف قدوائی ۰۰ — ۱۸

زادِ سفر (ترجمہ ریاض الصالحین) حصہ اول —— امۃ اللہ تسنیم ہمشیرہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۰۰ — ۲۲

〃 〃 〃 〃 دوم ۰۰ — ۲۴

قیمت کامل دو حصے ۰۰ — ۴۶

اسلام اور غیر اسلامی تہذیب —— شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ ۰۰ — ۱۲

نورانی جہیز —— مولانا مناظر احسن گیلانی - مولانا عبدالماجد دریابادی - مولانا سید عبدالرب صوفی ایم اے ۵/

محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے —— مولانا تقی الدین ندوی زیر طبع

صدر یار جنگ (مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی سوانح حیات) - مولانا شمس تبریز خان زیر طبع

حیاتِ خلیل (حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کی مفصل سوانح حیات) مولانا محمد ثانی حسنی ندوی زیر طبع

زاد المعاد —————— زیر طبع

اصح التبیر —————— زیر طبع

نبیِ رحمتؐ

نوعِ انسانی کے سب سے بڑے محسن، نبیِ رحمت حضور اکرم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ وحیاتِ طیبہ کے تاباں، درخشاں اور جاوداں نقوش۔ جس میں سیرت کو (اپنے ذوق ورجحان اور رائج علمی نظریات کا تابع بنانے اور زندہ حقیقتوں اور منہ سے بولتی ہوئی صداقتوں میں فلسفہ آرائی اور رنگ آمیزی سے کام لینے کے بجائے) اپنی حقیقی اور واقعی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، نئی نسل کے فہم اور نفسیات کی موجودہ سطح اور عصری و علمی اسلوب کا پورا خیال رکھا گیا ہے — قدیم وجدید دونوں قسم کے علمی مآخذ سے استفادہ کیا گیا ہے — بعثت کے وقت عالمگیر جاہلیت، معاصر ومتمدن حکومتوں اور پڑوسی ریاستوں کا جامع و معلومات افزا جائزہ۔

جزیرۃ العرب اور بالخصوص مکۂ مکرمہ اور مدینۂ منورہ کا اہم اور تاریخی پسِ منظر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، جس کو سمجھے بغیر اسلام کی کامیابیوں اور کامرانیوں کا پورا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔

— ایک ایسی کتاب جس میں سیرت خود اپنی ترجمانی کرتی ہے —

کامل ۲ دو حصے = /۴۵

عصرِ حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح

"پیش نظر کتاب ایک علمی و اصولی تبصرہ و جائزہ ہے، وہ نہ مناظرہ کے انداز میں لکھی گئی ہے، نہ فقہ و فتاوی کی زبان میں، وہ ایک اندیشہ کا اظہار ہے اور "الدّین النصیحۃ" (دین خیر خواہی کا نام ہے) کے حکم پر عمل کرنے کی مخلصانہ کوشش، اس کی کوئی سیاسی غرض ہے نہ کوئی جماعتی مقصد...... اس ناخوشگوار کام کو محض عنداللہ مسئولیت و شہادتِ حق کے خیال سے انجام دیا گیا ہے، جو لوگ دین کی سنجیدہ اور مخلصانہ خدمت کرنا چاہتے ہیں، ان میں طلبِ حق کی سچی جستجو اور اپنی دینی ترقی و تکمیل کا جذبۂ صادق پایا جاتا ہے، انھوں نے ہمیشہ صحت مند اور تعمیری تنقید اور مخلصانہ مشورہ کی قدر کی ہے، اور فکر وسعیِ اسلامی کی طویل تاریخ میں دین کے صحیح فہم و تفہیم، اور اسلام کی صیانت و حفاظت میں اس سے ہمیشہ مدد لی گئی ہے۔" (مستفاد از مقدمۂ کتاب)

قیمت ۸ روپے

عصرِ حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح

بعض معاصر تحریکوں اور تحریروں کے آئینہ میں
ایک جائزہ اور تبصرہ

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی

مجلس نشریات اسلام
ا۔کے۔۳۔ ناظم آباد مینشن، ناظم آباد
کراچی ۱۸